سعدیہ عزیز آفریدی

دل کے رنگوں میں

حُسن زندگی کا

سعدیہ عزیز آفریدی

دل کے رنگوں میں

ناولٹ

اس وقت وہ کالج سے نکلی ہی تھی کہ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی۔ اس نے اچٹتی سی نظر دوبارہ سامنے ڈالی اور ثابت ہو گیا کہ وہ خواب تھا نہ خیال بلکہ واقعی ایک جیتا جاگتا وجود لیے اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا صبح کا خیال "ہو گا کوئی بے چارہ" غلط ثابت کر رہا تھا۔ ورنہ گھر سے اپنے ساتھ ساتھ سفر کرتے اس شخص کو دیکھ کر اس کا یہی گمان تھا کہ ہو سکتا ہے اس کا روٹ بھی یہی ہو۔ دراصل بات یہ تھی وہ ہمیشہ منفی پہلو سے مثبت پہلو نکال ہی لیا کرتی اور ساتھ ہی ساتھ اسے گمان تھا جس طرح وہ دنیا کو سادگی اور سچائی سے دیکھتی ہے دنیا میں اور بسنے والے بھی اسی طرح سوچتے اور سمجھتے ہوں گے۔ دنیا اس کے لیے کتابوں کی خوب صورتی اور خیالوں کے بنت کیے محلوں جیسی اجلی اور حسین ومصفا ہوا کرتی تھی اور شاید اس کا یہی سبب تھا کہ آج تک اس نے جہاں سانسیں لی تھیں وہاں ایسے ہی خیالوں کا ڈیرا رہا کرتا تھا۔ پیار محبت سے گوندھی گئی اماں تھیں۔ پُر شفقت ماموں جان تھے۔ ممانی جان تھیں تو تنک چڑھی مگر پھر بھی تکلیف کے وقت وہ بھی برکھا سایہ بن جاتی تھیں۔ تین کزنز تھیں اور اس کی اپنی پانچ بہنیں، سب مل جل کر یوں رہتے کہ بس وہ ٹکڑا اسے زندگی محسوس ہوا کرتا۔ زندگی جو مہکار تھی، چہکار تھی مگر یکدم ہی چہکاریں دم توڑنے لگی تھیں اور دل میں عجیب طرح کا ہراس اور خوف پھن کاڑھے بیٹھ گیا تھا۔

"آخر یہ شخص ہے کون اور میرے تعاقب میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" اس نے شوز زمین پر ہولے ہولے بجا کر کئی بار سوچا پھر ڈرتے سہمتے سڑک پر اپنی بس کا انتظار کرنے لگی۔ چار قدم دور وہ شخص ابھی تک اس کی طرف متوجہ تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں سامنے تھیں لیکن عائشہ حاکم کی حسیات برملا اظہار کر رہی تھیں کہ وہ مکمل اس کی طرف ہی مرکوز ہے۔ شکر خدا کا یہی تھا کہ اس نے ابھی تک بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ اکیلے وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی تھی۔ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں مگر اس کی توجہ کسی اور طرف نہیں تھی اور عائشہ حاکم اس لیے ہی خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے میں حق بجانب تھی۔ لیکن اس وقت کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا سو وہ تن بہ تقدیر کھڑی ہی رہی یہاں تک کہ اس کی مطلوبہ بس اس کے سامنے آ رکی۔ وہ بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بس میں سوار ہو گئی۔

سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ شخص سامنے ہی کھڑا تھا۔ درپردہ اس کی تمام توجہ بھری ہوئی بس میں خود کو بیلنس رکھ کر کھڑے ہونے میں صرف ہو رہی تھی مگر عائشہ حاکم کو اب بھی پہلے والا احساس حاوی لگ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ دعا کر رہی

تھی کہ جلد سے جلد گھر آجائے حقیقتاً“ یہ بچکانہ سی دعا تھی اس لیے مطلوبہ وقت پر ہی اس کا گھر آیا۔ بس روک کر وہ اسٹاپ پر اتری‘ سڑک کراس کرتے ہی دوسری سمت میں اس کا چوتھا بنگلہ تھا مگر پاؤں ایسے من من بھر کے ہوگئے تھے کہ یہ فاصلہ صدیوں لمبا لگنے لگا تھا۔ وہ تیز تیز سانسوں کے ساتھ سڑک کراس کرکے دوسری طرف پہنچی تو بے ساختہ اس نے مڑ کے دیکھا‘ وہ شخص اس سڑک پر کھڑا ہولے سے مسکرائے جارہا تھا جیسے اب تک کی ساری کارروائی محض لطف اندوزی کی سادہ سی کوشش تھی۔

”جانے کیا سمجھتا ہے خود کو‘ میں کوئی ڈرتی ہوں اس سے۔“ اس نے گھور کے دیکھا پھر زمانے بھر کی تلخی سمیٹ کر ہنکارا بھر کر گردن موڑلی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ہیجانی کیفیت میں مبتلا اعصاب کو ایسا ہی لگا جیسے وہ یکدم تپتی دھوپ سے گھنے سائے میں آگئی ہو‘ یہ گھر کس قدر مختصر اور سادہ سا لفظ ہے مگر اس عام اور سادہ لفظ میں کتنی آسودگی‘ کتنا تحفظ ہے۔

اس نے چادر سر سے اتارتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھائے مگر ڈرائنگ روم میں اماں کی تیز تیز آواز میں بولنے کی آواز سن کر وہ متحیر رہ گئی۔ یہ طرز تخاطب اماں کا کبھی نہیں رہا تھا۔

وہ تو ہمیشہ اتنا ہلکا اور آہستہ بولتی تھیں کہ ایک بات کے لیے اسے کئی بار ٹھوکا دینا پڑتا اور ماموں جان کہتے۔

”بڑی سعید روح ہے میری بہن کی‘ یہی تو بولنے کا اصل لہجہ ہے‘ مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں وہ خواتین جو چلا چلا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نرمی میں جو تاثیر ہے وہ سختی میں کہاں‘ جیسے بولنے سے زیادہ اثر خاموشی میں ہوتا ہے۔“

اور وہ ہنس پڑتی ”سچ کہتے ہیں ماموں! اماں واقعی نایاب لوگوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں۔ آئندہ صدی میں یہ نادر و شاہکار وجود دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کا کوئی امکان نہیں۔“

اماں گھور کے دیکھتیں تو وہ ہنس کر ان کے گلے میں جھول جاتی پھر یقین دلانے والے لہجے میں کہتی۔

”اماں! آئی سویئر آپ اپنے وجود میں ایک نادر اور ماسٹر پیس ہیں۔ کاتب قدرت نے آپ کو تخلیق کرکے تخیل کا قلم توڑ دیا ہوگا۔“

”چل ہٹ‘ مت بنایا کر۔“

”میں کیا بناؤں گی۔ آپ کو تو اللہ نے خود اتنی فرصت سے بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔“

اور اماں کے پنکھڑی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہلکورے لینے لگتی‘ اور وہ ہاتھوں کا پیالہ بنائے ٹکٹکی باندھے انہیں تکے جاتی۔ میدے کی طرح شفاف رنگ‘ بڑی بڑی آنکھیں‘ لمبی پلکیں‘ ستواں ناک‘ سڈول جسم‘ لمبے کالے بال جن میں وقت نے کہیں کہیں چاندی بکھرائی تھی مگر لگتا تھا یہ ان کی ریاضت کا صلہ تھا کہ بادشاہ وقت نے ان کے ماہ و سال کو چاندی کی افشاں سے روپہلا کردیا تھا مگر اس وقت حیرت انگیز طور پر وہی اماں گھن گرج کے ساتھ تیز اور اونچا بول رہی تھیں‘ سو وہ حیرت سمیٹے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آرکی۔

ایک شخص سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اور عائنہ حاکم کو پتا نہیں یوں کیوں لگا جیسے وہ اس چہرے کو جانتی تھی۔ بہت قریب سے‘ بہت حساسیت سے۔

”پلیز عاصمہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”نہیں۔ اب ایک لمحہ بھی نہیں ہے آپ کے لیے۔ جب آپ کو ہماری پروا نہیں تھی تو اب کیا یہ ضروری ہے ہم آپ کی ایک ہی پکار پر اٹھ کر چل پڑیں۔“

”صرف ایک پکار یہ عاصمہ! دو مہینے ہوگئے ہیں مجھے تمہارے در سے نامراد لوٹتے ہوئے۔“

”اور مجھے اسی بات پر حیرت ہے‘ یہ سب تو آپ کے مزاج کے بہت خلاف ہے۔ آپ تو ایک بات سے دوسری بات بھی نہیں سنتے تھے۔“

”ہاں وہ بھی میرے مزاج کا ایک پہلو تھا اور یہ بھی میرے ہی مزاج کا رخ ہے کہ میں چاہتا ہوں میں تمہیں اور اپنی بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

”بیٹیوں کو حالانکہ آپ نے ان ہی بیٹیوں کی وجہ سے مجھ پر زندگی تنگ کردی تھی۔ آپ کو تو ان معصوم ودوں سے نفرت تھی ناں پھر کیونکر یہ نفرت محبت ں بدل گئی؟“

”صرف اس لیے کہ مجھے اب تم سب کی ضرورت ہے۔“

”محض ضرورت؟ یعنی اب بھی آپ کو محبت نہیں کھینچ لائی صرف ضرورت ہی کھینچ کر لائی ہے۔ حاکم سرور! آپ شاید کبھی نہیں بدل سکتے۔“

”ہاں شاید! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مگر پلیز‘ ایک دفع تو دو‘ کیا پتہ میں بدل ہی جاؤں اب جبکہ میرے پاس نہ ماہ و سال کی نقدی ہے نہ بلند آہنگ غرور رہا ہے۔ سب میری طرح تھک گئے ہیں عاصمہ! مجھے ارے کی ضرورت ہے۔“

اماں نے غور سے انہیں دیکھا اور بے قراری سے چھا۔

”کیا کیا ہوگیا ہے آپ کو؟“

اور بابا سائیں سہارا ملتے ہی ڈھے گئے۔ کسی ھوٹے سے بچے کی طرح رونے لگے۔ اماں قریب چلی آئیں اور عائنہ حاکم وہیں پردہ تھامے کھڑی رہی۔ رے میں بابا سائیں کی آواز ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ اپنے وجود کی دفاع کی آخری جنگ کی داستان نا رہے تھے۔ جس میں میڈیکل نے ثابت کیا تھا کہ وہ رنے والے ہیں۔ وہی دل جس نے ہزاروں چہروں کو اس میں بسایا‘ اپنوں کو دربدر کرکے‘ آج وہی بااختیار دل بے اختیار ہوچکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ خود فیصلہ کیا کرتے ے بنا کسی پس و پیش کسی خوف کے آج ان کے فیصلے نہیں اور ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنی مسند و اقتدار سے اپنی بے دخلی کو محسوس کرکے ان لیا تھا کہ وہ اب تک دھوکے میں رہے تھے اقتدار اور اختیار تو ہمیشہ اسی رب کے پاس رہا ہے سے وہ سدا روگردان رہے یا اگر یاد کیا بھی اسے تو ے ایک عام روزمرہ کا کوئی کام‘ رب کو رب کی انہوں نے کبھی مانا ہی نہیں تھا مگر اب ہر جگہ وہی

مان اور وہی حاکم دکھائی دے رہا تھا۔ اور بابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک نئے فیصلے کے منتظر اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں جیسے چاندی کے شفاف کٹوروں میں پہلی بارش کا پہلا پانی‘ وہ ضبط سے اماں کو دیکھتی رہی پھر بلک اٹھی۔

”اماں!“ اماں نے چونک کر پشت کی طرف دیکھا۔

”عائنہ!“ سر جھکائے بابا سائیں نے بھی چونک کر دیکھا۔ تین برس کی عائنہ حاکم‘ ان کی پہلی اولاد کس قدر بڑی ہوگئی تھی دو لمبی چوٹیاں گوندھے سفید یونیفارم میں وہ اپنی ماں کی طرح ہی پاکیزہ روح لگ رہی تھی‘ پاکیزہ روح یا شاید نیکی کی پری جس کا کام دلوں کا دکھ چننا اور غم بانٹنا تھا ازل سے اور ابد تک کے لیے۔

”بابا سائیں۔“ وہ بے ساختہ اندر بڑھ آئی تو بابا سائیں بے وقت اٹھے اور اسے اپنے سینے سے لگالیا اور عائنہ حاکم نے پہلی بار اپنے باپ کے دل کی دھڑکن اتنے قریب اور اتنے غور سے سنی اور سوچا۔

”اتنے متوازن انداز میں دھڑکنے والا دل یکدم بھلا کیسے تھم سکتا ہے۔ ڈاکٹر تو یونہی اپنی قابلیت جھاڑتے ہیں ورنہ چھ بیٹیوں کے ہوتے‘ ان کی محبتوں اور دعاؤں کے ہوتے بھلا موت اس کے باپ کو کیسے اچک سکتی ہے۔ وہ سب اپنے باپ کے لیے حصار بن جائیں گی۔“ اور وقت اس کی اس معصوم سوچ پر ہنس دیا‘ اور وہ بے خبر بابا سائیں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے انہیں تسلیاں‘ دلاسے دیتی رہی۔ زندگی کا فلسفہ محبت کی زبان میں سنائے گئی۔

اس وقت اس کے ذہن سے صبح والا واقعہ بھی بھول چکا تھا۔ وہ مکمل طور پر اپنے پیارے سے بابا سائیں کی طرف متوجہ تھی جنہیں وقت نے بے طرح تھکا دیا تھا اور بابا سائیں اس کا سر اپنے زانو پر رکھے اب تک کی دوری کا سبب بتا رہے تھے۔ رنجیدہ و شرمندہ سے کہ ایک وارث کے لیے انہوں نے کیسے کیسے نہیں عاصمہ حاکم کا دل توڑا۔ آج انہوں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ سب حقیقت گوش گزار کردی تھی اور اس نے بابا کے سچ کے باوجود ان کی محبت میں اس

ساری تشنگی اور محرومی کو پس پشت ڈال دیا تھا جو ماموں کی تمام تر محبت اور توجہ کے باوجود اس نے محسوس کی۔ پیرنٹ ڈے پے دل پر چرکے لگاتی اور سالگرہ پر ماموں کے دیے گئے تحفوں پر اس نے جو کمی محسوس کی وہ کبھی نہیں پوری ہو سکتی تھی کیونکہ وہ ماہ و سال کبھی پلٹ کر نہیں آسکتے تھے لیکن اب وقت کی طرح بابا سائیں پلٹ آئے تھے تو وہ ان کے آنے کی خوشی میں سب کچھ بھول گئی تھی' اسے سمجھوتہ کرنے کی پرانی عادت تھی اور بابا سائیں کا خیال تھا باقی سب بھی اسی طرح کا مزاج رکھتی ہیں لیکن دوپہر کو جب باقی بہنیں آئیں تو چار کو چھوڑ کر منجھلی والی امینہ حاکم اپنے ماہ و سال کا حساب لینے بیٹھ گئی۔ وہ جو ہمیشہ خاموش رہتی تھی آج بے تکان بول رہی تھی اور بابا سائیں تھے خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"امینہ پلیز' بابا سائیں کی طبیعت کا کچھ خیال کرو۔"

امینہ نے گھور کے عائشہ کو دیکھا پھر نخوت سے بولی۔

"کیوں صرف میں ہی کیوں کروں ان کا خیال' انہوں نے کبھی ہمارا خیال کیا؟ آخر ان کا تعلق ہی کیا تھا میری ماں سے' صرف اتنا کہ ہر سال دو سال بعد اماں کے پاس آکر اجازت نامے پر دستخط کرواتے اور نئی شریک سفر کے ساتھ چند قدم اور آگے بڑھ جاتے پیچھے اڑتی دھول سے بے پرواجوان کے سرپٹ دوڑنے سے اڑتی اور ہمارے وجود پر ایک گرد کی تہہ اور چڑھا دیتی' ایسی' ہم کہیں دکھائی ہی نہ دیتے۔ یہ ہیں عائشہ! ہمارے بابا سائیں جنہوں نے کبھی پروا نہیں کی ان کے ہوتے ہم کتنے لاچار و بے بس تھے' کتنے غیر محفوظ تھے۔ ایک بیٹے کی خواہش میں انہوں نے ہمیں کتنا رو کیا' ہے کیا ہم یہ سب بھول سکتے ہیں؟؟"

عائشہ نے کھینچ کر امینہ کو گلے سے لگا لیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بابا سائیں نے ہولے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ عائشہ کو چھوڑ کر ان کے سینے سے آ لگی۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔

"بابا سائیں! آپ نے ہمیں بھلائے رکھا مگر آج تک ہم اس پر قادر نہیں ہو سکے کہ آپ جو ہماری زندگی میں نہیں تھے تو ہم بھی آپ کو بھول جاتے۔ آپ کا وجود بظاہر ہماری پہنچ سے بہت دور تھا لیکن بابا سائیں! اماں سائیں کی باتوں میں اور ہمارے خوابوں میں ہمیشہ آپ کا ایک ہیولہ تراشیدہ رہا۔ آپ کے قدم ہمیشہ ہماری دہلیز پر ثبت تھے حالانکہ آپ نہیں تھے پھر بھی ہمیں لگا کہ آپ آنے والے ہیں۔ انتظار بہت جاں گسل ہوتا ہے بابا سائیں! آپ جانتے ہیں یہ۔!"

"ہاں' میں جانتا ہوں بیٹا! تب ہی تم تک تم سے ملنے آیا ہوں۔ انتظار صرف تم نے نہیں میں نے بھی کیا تھا مگر اس وقت مجھے اپنی احتیاجات اور جذبات کی سمت معلوم نہیں تھی یا پھر ایک وارث کا اس قدر خفقان تھا' اس شوریدہ خواہش کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ مجھے کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا' مجھے ہر اس چیز' ہر اس شخص سے نفرت تھی جو میری راہ میں رکاوٹ بنے۔ میں نے کتنے بے بس اور معصوم ہاتھوں میں آزادی کے پروانے پکڑائے۔ کتنوں کی خواہش کے قتل عام میں میری یہ خواہش ہراول دستہ رہی' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی' ابھی نہیں رہی تھی مگر وہ واقعی پہچانا جاتا ہے۔ اس وقت زیادہ ہی جب اپنے ارادے اور عزم شکست خوردہ اور ریت کی دیوار ثابت ہوں۔ میں نے بھی اسے پہچانا' اس وقت جب میرے پاس ہارنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں صرف ایک آس تھی کہ شاید میں ہار کر بھی جیت جاؤں' شاید میرا بھی کہیں انتظار کیا جاتا ہو' امینہ! بس یہی تمنا اس دہلیز تک لائی ہے مجھے لیکن تمہارا دل صاف نہیں تو میں تم پر بلکہ کسی پر بھی جبر نہیں کروں گا۔"

"نہیں بابا سائیں! ایسا تو نہ کہیں۔ آپ کا تو ہم پر بہت حق ہے۔ ہم آپ ہی کی محبت کا حصہ ہیں۔"

عائشہ حاکم نے بابا سائیں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تو باقی چاروں بیٹیاں بھی ان کے قریب آ گئیں۔ ماموں نے مسکرا کر بابا سائیں کو مبارکباد دی پھر ہنس کر بولے۔

"حاکم بھائی! مانتے ہو نا بیٹیوں کے معصوم محبت کی کشش کو۔؟"

"ہاں افسر بھائی! واقعی یہ بیٹیاں بہت میٹھی اور شیریں' دل سے لگا کر رکھی جانے والی نعمت ہوتی ہیں۔ میں پتہ نہیں کیوں اتنے عرصے تک یہ کفران نعمت کرتا رہا شاید یہ بیماری بھی اس ناشکرے پن کا شاخسانہ ہے۔ یہ میری سزا ہی تو ہے افسر بھائی کہ میرے دل نے ابھی دھڑکنا سیکھا ہی تھا کہ اب رکنے پر کمربستہ ہے۔ میں اس شہد آگیں احساس سے روح کو سیراب کرنا چاہتا ہوں اور بلاوے کی گھنٹیاں ہیں کہ مسلسل بجے جا رہی ہیں ابھی تو میں نے انہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے' پیار بھی نہیں کیا اور۔"

"اور کچھ بھی نہیں ہے آپ کو! ڈاکٹر تو بکتے ہیں۔ اتنی پیاری پیاری بیٹیوں کے ہوتے بھلا آپ کو کیا ہو سکتا ہے۔ ہم ہیں ناں آپ کی ڈھال' آپ کا ہتھیار' آپ کے جینے کی آس۔"

بابا سائیں کی غلافی آنکھوں میں سکون لہریں لینے لگا مگر اس سکون میں غم آلود سکوت بھی تھا جیسے یہ سب کچھ محض دل بہلاوے کا سامان تھا ورنہ حقیقت میں زندگی گھونٹ بھر تو بچی تھی۔ سینے سے نکلتی تو پلٹتی یا نہ پلٹتی کسے خبر تھی مگر وہ پھر بھی آس سے دل کو تھپکتے ہوئے کھلکھلاتی چہکارتی زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ سچ تو یہی سب کچھ تھا وہ ہی تھے جو اس سے مکرتے آرہے تھے' اور وہ چھ کی چھ تھیں کہ دیوانوں کی طرح پھر لیے بناء ان سے اتنے لمبے عرصے کی دوری میں ہونے والے حادثے' خوشیاں سب ہی کچھ شیئر کر رہی تھیں' ان کی تنہائی پر بلک رہی تھیں اور انہیں دلاسے دے رہی تھیں۔

"یہ رشتہ کس قدر آفاقی' کس قدر حسین ہے۔" وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے سوچے جا رہے تھے اور وہ سب ان میں مگن تھیں۔ پورے خلوص اور سچائی سے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس وقت وہ بستر پر اوندھا پڑا تھا۔ بظاہر اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن پھر بھی اس کے جذبات اس کے چہرے پر نقش تھے۔ لگتا تھا' وہ کسی اندرونی جنگ کا شکار تھا۔ کبھی رنگ سرخ پڑ جاتا' کبھی جلال سے یہ رنگ دو آتشہ ہو جاتا اور کبھی اس کے چہرے پر ملائمت آجاتی۔ بھوری مونچھوں تلے خوب صورت ہونٹ مسکرانے لگتے مگر مسکراہٹ گہری بھی نہ ہوتی کہ ہونٹ بے سبب بھینچ جاتے۔ چہرے کے خال و خد ایک بار پھر کھنچ جاتے۔ کتنی دیر سے وہ ان ہی خیالات کا شکار تھا کہ اچانک فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان ہاتھوں میں کھانے پینے کا سامان لیے اندر داخل ہوا۔ دروازہ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے نوجوان نے صرف ایک بار سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر تکیے پر سر ڈال کر دوبارہ سے خیالات کا تانا بانا وہیں سے جوڑنے لگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ آنے والے نوجوان نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی پھر کچن میں سامان رکھ کر آیا اور اس کے قریب ہی بیڈ پر آرام سے بیٹھ گیا پھر ملائمت سے بولا۔

"تمہیں آج پھر بیزاری کا دورہ پڑ گیا۔ صبح تو اچھے بھلے تھے پھر یہ اچانک؟؟"

"بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا کچھ کرنے کو۔"

"آخر دل کو ہوا کیا ہے؟" لمحہ بھر کو وہ رکا پھر آہستگی سے بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں ضمان! تم اس شہر میں آکر یکسر بدل گئے ہو۔ ہم میں کوئی بات بھی راز نہیں رہی تھی لیکن یہاں آکر تم راز ہی راز بن کر رہ گئے ہو۔ جانے کیا کام ہے جو کرتے پھر رہے ہو' مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں تم۔"

"پاگل مت بنو' میں ایسے ہر کام کے خلاف ہوں جو میرے یا ملک کے لیے نقصان دہ ہو۔"

"پھر تم کیا کرتے پھر رہے ہو' مجھے کچھ پتا تو چلے' آج کل تو دفتر میں بھی نہیں بیٹھتے' سیدھے منہ بات نہیں کرتے' سچ بتاؤ' کیا واقعی ہم اب بھی دوست ہیں یا کوئی بھی نہیں رہے ایک دوسرے کے؟؟"

ضمان حیدر یکدم اٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے مسکرایا۔

WWW.PAKSO

"آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ ہم ایک دوسرے کے کچھ نہیں رہے۔؟"

"بس ویسے ہی اس شہر کی بابت یہی سنا ہے۔ یہاں آنے والے عظیم اور گہرے رشتے بھی بھلا دیا کرتے ہیں۔ ہم تو محض دوست ہیں اور۔"

"اور والا رشتہ زیادہ مضبوط ہے۔ کیا ہماری محبت کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہمیں ایک ہی ماں نے جنم دیا ہے۔"

"میرے لیے شاید مگر دنیا کے لیے یہی سب سے زیادہ ناپائیدار رشتہ ہے۔"

"حالانکہ ہمیں اپنی زندگی اور نسبتوں کو اپنے پوائنٹ آف ویو سے دیکھنا چاہیے۔ جب تمہیں ایسا نہیں لگتا تو پھر تمہیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"

"میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ نہ سوچوں مگر جب تمہاری خفیہ کارگزاری دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں تمہارے لیے ڈسٹربنس کا سبب ہوں۔"

"احمق ہیں آپ اچھے خاصے۔ ایسے کیوں سوچتے ہو بھئی؟" اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تو سلمان اسے گھورنے لگا۔

"ضمان یہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

"کیا بھئی؟؟" اس نے سگریٹ کو شعلہ دکھاتے ہوئے بے پروائی سے پوچھا تو وہ کچھ کہے بنا کچن میں چلا گیا۔ ضمان حیدر نے تھکے تو دو تین کش لیے مگر پھر سگریٹ بجھا کر خود بھی کسلمندی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ ناراض نوجوان لائی ہوئی سبزی پر سارا غصہ صرف کر رہا تھا۔ ضمان حیدر کچھ دیر تو اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر اس نے اس کی پشت سے جا کر اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

"ہٹو ضمان! تمہیں میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں۔"

"ارے واہ مانی! تمہاری پروا ہی تو رہی ہے ساری عمر۔ دیکھ لو اس وقت بھی تمہاری مدد کے خیال سے کچن میں چلا آیا ہوں ورنہ تم تو جانتے ہو میں کتنا عدیم الفرصت ہوں۔" جواب پھر بھی نہ آیا تو اس نے گرفت مزید سخت کی۔

"او سلمان کے بچے! کیا تجھے اس پر یقین نہیں کہ میں عدیم الفرصت نہیں ہوں یا۔"

"مجھے تمہاری دونوں باتوں پر یقین نہیں ہے۔ چند الٹی سیدھی حرکتوں کو کام نہیں کہا جا سکتا اور میری پروا؟ تمہیں میری پروا کبھی نہیں رہی ہے۔"

"او ظالم انسان! کیا بکتا ہے۔ مجھے تیری پروا نہیں ہے۔ آخر یہ کیوں لگا تمہیں؟؟" سلمان حیدر نے گھور کے دیکھا پھر غصے سے دوبارہ پالک کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"ہاں بھئی، اب بک بھی چکو۔ تمہیں ایسا کیوں لگا کہ مجھے تمہاری پروا نہیں رہی؟؟"

"سامنے کی بات ہے اگر نظر آئے تمہیں تو۔ ہر وقت انجن بنے رہتے ہو پھر مجھ سے پوچھتے ہو اور جان جلانے کے لیے کیا تمہیں یہ نہیں پتا مجھے اسموکنگ کرنے والے لوگ کتنے برے لگتے ہیں اور شاید تمہیں یہ بھی پتا نہ ہو گا کہ اسموکنگ صحت کے لیے کتنی خطرناک ہے۔"

"اور اگر میں کہوں مجھے اس زندگی سے ہی نفرت ہے تو پھر؟؟"

"تو میں کہوں گا تم ناشکرے ہو یا تمہیں خود ساختہ خود رحمی میں مبتلا رہنے کی عادت ہے ورنہ کیا نعمت ہے جو دنیا اور زندگی نے تمہیں نہیں دی۔"

"نعمت سے ہٹ کر بھی تم نے اس کی اذیت کو شاید محسوس نہیں کیا۔ تمہیں ماں سے محبت بھی اور مجھے ماں سے عشق۔ سلمان! میں نے ماں کے آنسو دیکھے ہیں اور تم نے صرف ان کے قہقہوں، مسکراہٹوں میں زندگی کو محسوس کیا ہے یہی وجہ ہے تمہارے مقابلے میں میں زندگی سے زیادہ روٹھا ہوا اور زندگی کی طرف سے زیادہ تلخ ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تلخی کا مطلب یہ نہیں کہ تم زندگی جیسی نعمت کو ٹھکرانے پر تل جاؤ، زندگی کی تلخی تمہارے لیے امرت بھی بن سکتی ہے اور تمہاری کامیابی بھی۔ اگر تم اس کے دیے ہوئے زخموں کو بھلا کر اپنے لیے خود پھول چن لو۔ یہ ہر

شخص کے لیے ایک سی ہوتی ہے ضمان! اس کے اندر محبت ہوتی ہے نہ وفا، لیکن ہمیں پھر بھی اس کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے اور جب یہ طے ہی ہے کہ دم آخر تک ہمیں ساتھ ہی رہنا ہے تو میرے خیال میں ہمیں اس کی بے وفائی اور بے مہری کے گلے کرنے کے بجائے اپنے لیے اس سے خوشیاں چھیننے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ خوش امیدی ایک مؤثر ماسٹر کی ہے جس سے ہر بند دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرے اندر جتنی نفرت ہے، وہ صرف انتقام سے پوری ہو سکتی ہے۔"

"حالانکہ انتقام اور نفرت تمہارے مزاج کے موافق ہی نہیں۔ تم ماں کی محبتوں سے گوندھے گئے ہو ضمان! تم اور نفرت یہ دونوں کبھی باہم نہیں ہو سکتے جیسے شک اور محبت ایک ساتھ دل میں قیام نہیں کر سکتے تم بہت اچھے انسان ہو پھر یہ انتقام کی رٹ اور خناس کیوں ہے تمہارے سر میں؟؟"

"بس یہی میرا وعدہ ہے خود سے، اماں نے جب بظاہر آنکھیں بند کی تھیں مانی! تو میں نے ان کے اسٹریچر کی طرف اچٹتی سی نظر ڈال کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ آنکھیں اب کبھی نہیں کھلیں گی۔ ان آنکھوں کی تھکن بتاتی تھی مانی کہ وہ کس قدر اکتا گئی تھیں۔ زندگی سے۔ وہ میرے اور تمہارے لیے زندہ تھیں۔ بابا کی محبت کا عہد لیے جی رہی تھیں مگر ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تو ان کے اعصاب نے "نیند نیند" کا شور ڈال دیا۔ وہ سو جانا چاہتی تھیں لیکن ان کے دل میں ہماری خوشیاں دیکھنے کی ہوک بھی تھی۔ ان کی تھکی آنکھوں میں ہماری شاداں فرحاں زندگی کا ایک خیال ہلکورے لیتا تھا مگر تھکن اس کے سامنے جیت گئی اور اور مانی! میں نے یہی انتقام لینا ہے اس کے ایک ایک عزیز سے کہ وہ بھی اسی طرح تل تل کر کے مرے، میں اپنی ماں سے کہیں زیادہ آنسو دیکھنا چاہتا ہوں اس کی آنکھوں میں۔"

کہتے کہتے یکدم وہ تھم گیا تو سلمان نے چھری رکھ اس کی ٹھوڑی اوپر کی پھر دھیما سا بولا۔

"تو بہت سوچتا ہے ضمان! شاید اس لیے تجھے یہ سب کچھ قاتل لگتا ہے ورنہ ہمارے مذہب میں معاف کر دینا زیادہ افضل ہے۔"

"ہاں مگر ان کے لیے جن کے پاس طاقت اور حوصلہ نہ ہو اور تم جانتے ہو نا میں کمزور ہوں نا بزدل۔"

سلمان حیدر اسے دیکھنے لگا۔ دکھ اور درد کی انتہا نے اسے کفر بکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اللہ کا حکم ٹھکرا رہا تھا۔ شاید ماں اس کے لیے سب ہی کچھ تھی اور وقت نے ماں چھین لی تو اس کی نظر میں ہر چیز غیر ضروری ہو گئی تھی، ہم رہا تھا تو صرف انتقام اور نفرت، اور نفرت واحد جذبہ ہے جس میں بندہ کبھی دماغ سے نہیں سوچتا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دل سے کیے گئے کسی فیصلے کی سزا بھگتے لیکن یہ سب باور کرنے کے لیے موقع کی تلاش ضروری تھی سو فی الحال موڈ بحال کرنے کے لیے اس نے پالک کاٹ کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"اسے دھوؤ اچھی طرح۔ آج کے سالن میں کر کل آئی ناں تو بہت برا ہو گا۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ مسکرا رہا تھا، سو بھا گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں کیا خانساماں ہوں تمہارا؟"

"نہیں تم تو میرے ہیرو نمبرون ہو مگر اسمارٹی! پیٹ پوجا کے لیے یہ سب کرنا پڑے گا۔"

"آخر کیوں کرنا پڑے گا۔ یہ ہوٹل کس دن کے لیے بنائے گئے ہیں؟؟"

"صرف پیسے کی بربادی کے لیے یا تمہارے جیسے کاہلوں کے لیے جو کام سے جان چراتے ہیں۔"

"بکو تو مت مجھ سا کای بندہ بھی آج تک دیکھا ہو گا۔"

"ہاں دیکھ ہی رہا ہوں۔ مسلسل تین مہینوں سے روز صبح اٹھتے ہیں تیار ہوتے اور نکل جاتے ہیں۔ دوپہر کو اس وقت آتے ہیں جب سارے کالجز کی چھٹیاں ہو چکتی ہیں۔ اے ضمان کے بچے! کہیں تم آج کل گرلز کالج کے پھیرے تو نہیں لینے لگے؟؟"

"بکو مت۔"

"کیوں نہ بکوں میرا دماغ بل کر رہ گیا ہے۔ اچھا خاصا کاروبار ہے۔ منیجروں پر چھوڑ کر یہاں کرائے کے فلیٹ میں دھرے ہو، اوپر سے گارڈز فراہم کرنے کی ایجنسی کھول کر بیٹھ گئے ہو۔ آخر یہ سب ہے کیا؟ یہ تم گارڈز کیوں فراہم کرنے لگے ہو؟؟"

"محض اس لیے کیونکہ یہ کراچی ہے مائی ڈیر اور یہاں یہی کاروبار زیادہ ان اور پاپولر ہے۔"

"لیکن تم تو دفتر میں بھی نہیں بیٹھتے۔ صرف مجھے ہی مکھیاں مارنی پڑتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں مار خان بننے کا مارجن تو ہے تمہارے پاس کرتے رہو خدمت خلق۔"

"یہ خدمت خلق ہے؟ اتنی مہنگی سیکورٹی مہیا کرتے ہو اور اسے تم خلق خدا کی خدمت پر محمول کرتے ہو۔ شاباش ہے تمہارے ڈھٹائی پر۔"

"ڈھٹائی ہی تو ہونی چاہیے، بڑے سے بڑا جرم معاف ہے آپ کو۔ یو نو مجرم کون ہے، وہ جو پکڑا جائے اور عقل مند وہ ہے جو ہمیشہ جرم کر کے بچ جائے۔"

"دیکھو، دیکھو تم نے پھر میرے خدشات کو ہوا دی ہے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے۔ تم کوئی خطرناک کام نہیں کر رہے۔"

"تو بابا میں خطرناک کام تو اب بھی نہیں کر رہا، میں نے تو تمہیں ڈھٹائی اور مجرم کی غرض وغائیت اور تھنکنگ بتائی ہے۔ رہا یہ کہ میری سیکورٹی ایجنسی مہنگی سیکورٹی فراہم کرتی ہے تو میری جان! ہمیں اس شہر میں اور اسی بنگلے سے دفتر میں بیٹھنا ہے اگر میں نے ذرا سی حاتم طائی فطرت ظاہر کی تو ہم دوسرے ہی دن سڑک پر دھرے ہوں گے اور کوئی ہمیں مفت میں بھی خریدنے کو تیار نہیں ہو گا۔" وہ ہنسا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مانی! تم ایک دم سیدھے ہو کیا نہیں جانتے جو شخص گارڈ رکھ سکتا ہے، وہ اسے رکھنا افورڈ کرتا ہے تب ہی اتنا بڑا قدم اٹھاتا ہے جب اس شہر میں پیسے کی گنگا بہہ رہی ہے تو ہم اگر اس میں نہا لیں تو کیا برا ہے۔"

سلمان اسے دیکھے گیا پھر آہستگی سے بولا۔

"میں نہیں سمجھ سکا تم کیا کرنے والے ہو اور کیا سوچے بیٹھے ہو۔ تم ضمان! تم بھی دولت کو سب سے آخری مارجن گردانتے تھے شخصیت کا، تم کہتے تھے دولت سے وہ مرعوب کرتے ہیں جن کی شخصیت میں اور کچھ نہ ہو جو خالی ڈبے کی طرح ہوں تو دولت کی گل کاری ہی ان کی شخصیت پہ بیل بوٹے بناتی ہے مگر آج یہ تم ہی ہو کہ دولت پر گھنٹہ بھرے رطب اللسان ہو میں کیا سمجھوں اس سے۔ پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔" اس نے پالک پتیلی میں ڈال کر سنک میں نلکے کے نیچے رکھا پھر دوسری خالی پتیلی میں دھو دھو کر ڈالنے لگا، اس کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے اور ضمان نہایت انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا پھر ضبط نہ ہو سکا تو شرارت سے بولا۔

"مانی یار! سچ ماں نے تو تجھ میں پورا کا پورا اپنا آپ اتار دیا ہے۔ تو ہم میں سے تو بالکل نہیں لگتا۔ سر سے لے کر پیر تک ایک پتی ورتا قسم کی لڑکی لگتا ہے۔"

"بس بس۔ کام ہوتا نہیں زبان چلانے میں ماہر ہو۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ مجھے سالن بھی پکانا ہے۔"

"ارے واہ! بالکل لڑکیانہ ٹون میں بولنے لگا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں کسی دن مجھ پر کچھ اور ہی انکشاف نہ ہو جائے کہ میں۔"

"فضول بکنے سے بہتر ہے اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا کوئی بری بات نہیں اور سچ پوچھو تو یہ ساری آفت تمہاری لائی ہوئی ہے۔ اچھا بھلا رہتے تھے لاہور میں۔ دائیں بائیں نوکروں کی فوج ظفر موج تھی مگر نہیں جناب! سکون آپ کی گھٹی میں ہے ہی کہاں، بس بے سروسامانی میں آ پڑے یہاں بنا سوچے سمجھے۔ وہ تو شکر کرو ماں کی مدد کی غرض سے کچن میں ان کا ہاتھ بٹانے سے گھر سنبھالنا کھانا پکانا آتا تھا ورنہ ہوٹلوں کے وہ بدمزہ کھانے کھانے کو ملتے کہ نانی یاد آ جاتی۔"

"مگر کیوں؟ صرف نانی کیوں یاد آتی ہیں ہر مشکل میں۔ دادی کیوں یاد نہیں آتیں۔ کیا دادی الجبرا کا سوال

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

ہوتی ہیں ؟؟"

"پتہ نہیں۔ چلو ہٹو یہاں سے۔"

اس نے زبردستی اسے کچن سے دھکیلا اور وہ اسے ایک عظیم انسان کا تمغہ تعویض کرتا اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ چہرے کی بشاشت اور مسکراہٹ یکدم ہی پتھریلی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کرلیا پھر ٹیلی فون اپنی طرف کھسکا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پر ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔

"ہیلو! جی کس سے بات کرنی ہے ؟؟"

"تم سے۔ تم صبح والی بےبی ہو نا ؟؟"

"جی! آپ کون بول رہے ہیں؟۔"

"تمہارا دشمن' جو سایہ بن کر ہر وقت تمہارے ساتھ پھرتا ہے مگر سن لو' اب تم مجھ سے بچ نہیں سکو گی۔ میں تمہیں کڈنیپ کرلوں گا۔"

"کیا فضول بکواس ہے یہ۔"

"عائنہ! کون ہے بیٹا۔ کیا ہوا عائنہ؟۔" مختلف آوازیں اطراف میں ابھرنے لگیں تو اس نے جنونی قہقہہ لگا کر ریسیور رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دروازہ کھولے سلمان حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔

"یہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کب سے لگے ہو۔ آخر اس کا مقصد؟؟"

"یہ مقصد میں اچھی طرح جانتا ہوں' سو ضروری نہیں کہ اس مقصد سے تمہیں بھی آگاہ کروں۔"

"تم ہوش میں تو ہو۔ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ کیا بھول گئے میں کون ہوں؟؟"

"نہیں' میں بھولتا ہی تو نہیں ہوں مانی! میں بھول جانا چاہتا ہوں مگر نہیں بھول سکتا اور یہی دوہری کیفیت ہے جو مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ میں تم سے بھی مس بی ہیو کرتا ہوں' اکثر کرتا ہوں مگر مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا' میں مجبور ہوں مانی! مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی برا ہوں' ہے ناں' واقعی بہت برا۔"

"بکومت' میرے بھائی ہو کر تمہیں جرأت کیسے ہوئی خود کو برا کہنے کی' یہ جو وجود ہے ناں یہ صرف تمہارا نہیں ہے' اس کے جملہ حقوق ماں نے مجھے بھی تفویض کر رکھے ہیں سو تنہا تم اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔" یہ کہتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"کون کہتا ہے اس چہرے کو برا۔ اتنا پیارا من موہنا سا تو روپ ہے تمہارا۔ جو ایک بار دیکھ لے تمہارا اسیر ہو جائے۔"

ضمان نے لگا کچھ سنا ہی نہیں' کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا پھر پلٹ کر بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا چہرہ واقعی ایسا ہی ہے کہ جو دیکھ لے اسیر ہو جائے۔ کبھی کبھی تو میرا چہرہ مجھے بھی بہت پرکشش لگتا ہے۔ سوچتا ہوں اگر ماں نے اس چہرے کے پیچھے دھوکا کھایا تو وہ واقعی بے خطا تھی مگر میں کیا کروں مانی! مجھے اسی لیے خود سے حد درجہ نفرت ہے کہ میرا چہرہ اس شخص کا پرتو ہے جس سے مجھے انتقام لینا ہے۔"

"پھر انتقام۔ آخر تمہارا یہ سرسام کب اترے گا ؟؟"

"شاید کبھی نہیں یا اس وقت جب میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا اور تم دیکھنا میں یہ جنگ ضرور جیتوں گا۔"

"چاہے اس جنگ میں جذبوں' رشتوں' مان اور بھرم کی لاشیں یہاں سے وہاں تک بکھری رہ جائیں ؟؟"

"ہاں۔ چاہے ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا اور پھر مانی یہ تو ہوتا ہی ہے ہر جنگ میں اور اس کے اختتام کے بعد یہی سب کچھ ہوتا ہے چند لاشیں' خون اور ناشاد آرزوؤں کی مٹھی بھر راکھ' یہاں سے وہاں تک چکراتی ہوئی۔ یہی کچھ حاصل ہے جنگوں کا۔ ازل سے اور شاید ابد تک۔"

سلمان نے دلگیری سے اپنے ماں جائے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکلتا چلا گیا کہ اس وقت یہی بہتر تھا۔

——*

عائنہ نے جب سے وہ ٹیلی فون ریسیو کیا تھا تب سے مسلسل روئے جا رہی تھی' اور بابا سائیں پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ آخر کون شخص ہو سکتا ہے وہ جس نے ان کی بیٹی کو دھمکی دی۔ مسلسل ایزی چیئر پر وہ پیشانی پر ہاتھ دھرے اب تک کے تعلقات اور دشمنیوں کو گن رہے تھے مگر واضح جواب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ کبھی انہوں نے کسی سے برا رویہ نہیں رکھا تھا اور دنیا میں سارے ہی ان کے دوست تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے زعم اور غرور میں کبھی کسی سے اچھا سلوک روا ہی نہیں رکھا تھا' ان کا کوئی دوست تھا ہی نہیں۔ وہ سارے جہان میں اجنبی تھے۔ یا کوئی تھا ان کا تو بغض و عناد سے بھرے دشمن اور ان کی تعداد اتنی تھی کہ بابا سائیں کو شمار کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے وہ؟؟" بابا سائیں نے پوری آنکھیں کھول کر عائنہ کو دیکھا۔

ایک لمحے کو خیال ہوا کہیں اس کی ذاتی جان پہچان ہی نہ وجہ دشمنی بن گئی ہو مگر اس کے تقدس سے دمکتے چہرے کو دیکھ کر ان کا دل انکاری ہو جاتا۔

"نہیں عائنہ اس رکھ رکھاؤ کی نہیں اس میں تو ایک ٹھہراؤ ہے' کسی ندی کا سا نہیں' سمندر کا سا ٹھہراؤ اور جو سمندر ہو کر اپنی حد اور اپنے ظرف کا پیمانہ ہر وقت تھامے رہے' وہ منہ زور موجوں کی طرح کیسے چھلک سکتا ہے۔"

"پھر کون ہے؟ کون ہو سکتا ہے؟۔" انہوں نے پرسوچ نگاہوں سے پھر سے عائنہ کو دیکھا پھر مدھم سا پکارے۔

"سنو عائنہ! تم کل کالج نہیں جاؤ گی۔"

"بابا سائیں! یہ کیوں؟ کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ۔" بابا سائیں کے وجود میں ایک ٹیس اٹھی۔ بیٹی کی شرافت کا اعلان کرتی اور اس کے خیال کو رد کرنے والی ٹیس اور اٹھ کر وہ اس کے قریب چلے آئے پھر سر پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے بولے۔

"میرا وقار تم سے ہے عائنہ! میں نے کبھی عزت اور وقار کو مشکل نہیں دیکھا لیکن اگر ان کی کوئی صورت بنتی ہوگی تو وہ میری بیٹیوں کا ہی پرتو ہو گا۔"

"بابا سائیں!" اس نے بابا سائیں کا ہاتھ تھام کر

بہنوں کے لیے خوشخبری

سچی داستانیں

خواتین ڈائجسٹ بہنوں کے لیے اپنی نوعیت کا ایک منفرد پرچا تھا،
اس کے بعد اس ادارے سے بہنوں کے لیے 'کرن' اور 'شعاع' کا اجرا ہوا
اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان پرچوں کا شمار بہنوں کے مقبول ترین پرچوں میں ہوتا ہے،

اب
ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے
ایک نئے انداز کے جریدے
'سچی داستانیں'
کا اجراء کیا جا رہا ہے،
حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے، آپ کی نظر سے بہت سی ایسی حقیقتیں گزری ہوں گی،
انہیں اپنے الفاظ میں لکھ کر بھجوا دیں' ہم نوک پلک سنوار کر شائع کر دیں گے۔
تین بہترین کہانیوں پر انعامات دیے جائیں گے

بھجوانے کا پتا

محمود خاور — ایڈیٹر سچی داستانیں
۳۷ اردو بازار کراچی ۷۴۲۰۰

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

روتا شروع کردیا تو وہ قریب ہی بیٹھ گئے۔

"پھر بولے" میں نے تمہیں کل صرف اس لیے جانے سے روکا ہے کہ میں سمجھ نہیں سکا اس فون کال کو۔ بیٹا! یہ مشہور سہی کہ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے لیکن کون جانے گرجنے والے بادل گرجنا بند کرکے کب برسنا شروع کردیں۔ اس لیے میں اس کال کو محض دل لگی یا ڈراوا نہیں سمجھ سکتا اور تمہیں میرے ماضی کے باعث تکلیف پہنچے میں یہ بھی نہیں برداشت کرسکتا۔"

"پلیز بابا! یوں نہ کہیں، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

"ہونی بھی چاہیے تمہیں شرمندگی ہونی ہی چاہیے بیٹا! میرا ماضی بہت داغ دار ہے لیکن اب تو میں تائب ہو چکا ہوں ناں پھر میرے اعمال میرے بچوں کو ہراساں کرنے کے لیے کیوں صورتیں بگاڑ رہے ہیں۔"

"بابا سائیں! فار گاڈ سیک۔ آپ خود کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں۔"

"کیا واقعی میرے بھول جانے سے میرا ماضی بھی سب کے ذہنوں سے وقت کے صفحات سے اور لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ آج تک ایسا ہوا ہی نہیں ہے مگر اس میدان کا ہر شہسوار یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک الگ تاریخ رقم کرے گا۔ وہ بدنامی کو شہرت اور سنگ دلی کو اعلیٰ نسب کی خاندانی وراثت پر محمول کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہیں ترازو ہے جو اس کے ہر عمل کو انصاف پر تول رہا ہے اور اس کی کج خلقی، سنگ دلی، بے راہ روی وہ باٹ ہیں جن کے وزن سے اس کا خسارہ دو چند ہے، اتنا زیادہ کہ وہ رب جو صرف رحمت ہے وہ بھی اس پر نظرِ کرم ڈالنے کو تیار نہیں لیکن عائنہ! افسوس یہ سب اس وقت میں سمجھ آتا ہے جب ہمارے پاس نہ وقت ہوتا ہے نہ مہلت۔"

"نہیں بابا سائیں! وقت اس وقت تک آپ کا ہے، مہلت آپ کے لیے ہے جب تک آپ بسترِ مرگ سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں۔ توبہ کا در کبھی بند نہیں ہوتا بابا سائیں! اور یہ وہ عنایت ہے جو کسی پر اتارتا ہے وہ رب، رہی وقتی پریشانی تو میں پریشانیوں کو انسان کو مضبوط کرنے اور اس کی صلاحیتوں کو جِلا دینے کا نامحسوس عمل گردانتی ہوں یہاں تک کہ وہ عمل ہی ہمارے لیے جزا بن جاتا ہے۔"

"عائنہ! میری بچی! کس قدر پیاری ہے تو اور اس سے خوبصورت ہیں تیری باتیں لیکن پھر بھی ایک باپ کا دل تسلی پانے میں ناکام ہے۔"

"محض اس لیے کہ ابھی تک آپ نے میرے عزم اور حوصلے کو ناپا نہیں ہے، اس خدا کی عظمتوں اور اس کی حاکمیت کو مانا تو ہے تسلیم بھی کیا ہے مگر اسے محسوس نہیں کیا۔ ہر چیز محسوس کرنے سے عظیم ہوتی ہے بابا سائیں! یہ احساس ہی تو ہے جو آپ کو اشتباہِ خرد و نظر سے بچالیتا ہے۔ سراب اور حقیقت میں تمیز سکھاتا ہے۔ احساس انسان کی کیمسٹری کی ماسٹر کی ہے بابا سائیں! جس سے ہر تالا کھل سکتا ہے۔ احساس ہی تو انسان کو حیوان سے بلند تر کرکے اشرف المخلوقات بناتا ہے "خدا ہے" کو ایک بامعنی اور ٹھوس دلیل دیتا ہے۔ یہ تو سب سے بڑا انعام ہے بابا سائیں۔"

"ہاں مگر یہ صرف تمہارے جیسے سادہ اور پاک دلوں پر اتارا جاتا ہے عائنہ! میرا دل تو بڑا ہی سیاہ ہو چکا ہے، زنگ آلود سا ایک بے کار سا دل۔"

"نہیں، بس اب کبھی یہ نہیں کہیں گے آپ۔" لمحہ بھر کو رکی پھر سعادت مندی سے بولی۔

"آپ اپنی قدر میرے دل سے پوچھیں بابا سائیں! میں نے بلکہ ہم بہنوں نے جس طرح آپ کے وجود کی آس باندھی، آپ کے آنے کی دعائیں کیں بلکہ ہماری دہلیز پر ہماری دعائیں آج بھی ہاتھ اٹھا کر سہمی کھڑی ہیں اس خوف سے کہ کہیں یہ کوئی خواب نہ ہو، رہا آپ کا حکم تو وہ سر آنکھوں پر لیکن سوچیے بابا سائیں یہ کسی مسئلے کا مستقل حل تو نہیں۔"

"پھر تمہارے ذہن میں اس کا کونسا مستقل حل ہے؟؟"

"میرے ذہن کی پوچھتے ہیں تو سب سے پہلا اور آخری آسرا اللہ کا ہے لیکن اگر کسی سیکورٹی ایجنسی سے رابطہ کیا جائے تو کیسا رہے گا؟؟"

بابا کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "ہاں یہ صحیح رہے گا میں ابھی فون کرتا ہوں کسی ایسے گارڈ کے لیے جو تم ساری بچیوں کا تحفظ کرسکے۔" تمہیں تمہارے تعلیمی اداروں میں بہ حفاظت پہنچا سکے" بابا سائیں نے فون اپنی طرف کھسکا لیا۔

دو تین سیکورٹی ایجنسیز سے معاملہ کرنے کی کوشش کی مگر کہیں بات نہ بن سکی۔ بالآخر اخبار میں دیکھ کر "زی ایس سیکورٹی" ایجنسی کا فون نمبر ڈائل کیا اور بات کرتے ہی انہیں محسوس ہوا جیسے بولنے والے کی آواز ہی تحفظ کا منبع ہے سو فوراً ہی انہوں نے بات چیت طے کرلی۔ تمام معاملات طے پاگئے تو وہ اس گارڈ کا انتظار کرنے لگے جسے ایجنسی نے ان کے لیے ہائر کیا تھا۔ ٹک ٹک کرکے کتنا ہی وقت بیت گیا تب کہیں ملازم نے گارڈ کی آمد کی اطلاع دی اس وقت جب وہ سب کھانے کی میز پر تھے۔

"ٹھیک ہے۔ تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔" بابا سائیں بولے پھر جلدی جلدی کھانا ختم کرکے بابا سائیں اور ماموں ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئے اور عائنہ حاکم آمنہ اور وہ سب بہنیں ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے گارڈ کو دیکھنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے پر کمربستہ تھیں۔ لمبا اونچا سا نوجوان گھنی مونچھوں، فرنچ کٹ داڑھی اور عینک سمیت انہیں عجیب سا لگا۔

"آپی یہ! یہ ایسا ہوتا ہے گارڈ؟"۔

"پتا نہیں آج سے پہلے میں نے بھی کوئی گارڈ نہیں دیکھا، شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" عائنہ نے بدقت کہا۔ تو آمنہ اسے ٹھوکا دینے لگی۔ عائنہ! یہ شخص تو صرف شاعر لگ سکتا ہے یا پروفیسر اس سے بھلا مجرم کہاں ڈریں گے۔

"بات تو سوچنے کی ہے لیکن کیا پتہ یہ بھی اس کی پروفیشنل ڈریسنگ کا حصہ ہو۔"

"بات ڈریسنگ کی نہیں شکل کی ہے۔ سچ اپیا اس کو دیکھ کر تو خوامخواہ رحم آتا ہے۔"

"بکواس نہیں۔ ہمیں بابا کا حکم اور ان کی رائے دیکھنی پڑے گی جو وہ فیصلہ کریں۔"

"لیکن اگر بابا سائیں نے اس آرٹسٹ بندے کو گارڈ مقرر کرلیا تو؟؟"

"تو اچھا ہوگا، ظاہر ہے بابا سائیں کچھ تو دیکھ کر ہی اسے گارڈ مقرر کریں گے۔"

"مگر مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص اسلحہ چلانا بھی جانتا ہوگا۔"

"سوچنے کی بات ہے لیکن خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" عائنہ حاکم نے کندھے اچکائے تو وہ سب کمرے میں آبیٹھیں اور ایک گھنٹہ بعد بابا سائیں بتا رہے تھے کہ انہوں نے "ذی جاہ" کو ان کا گارڈ مقرر کردیا ہے۔

"اُف! وہ نام بھی تو شخصیت سے میچ نہیں کرتا۔"

"بکو مت عانیہ! اچھا خاصا لمبا تڑنگا بندہ ہے بس چہرے سے کچھ مسکین تو لگتا ہے اور بات ہے۔"

"ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اس کے ڈیل ڈول پر تو شیر افگن، رستم، سہراب یا اسفندیار جیسے نام زیادہ جچتے۔ ویسے اب بھی ایک ابہام ہے۔ کیا واقعی یہ ڈیل ڈول کے مطابق ہی ری ایکٹ کرسکے گا یا مجرم ہمیں اغوا کر رہے ہوں گے اور جناب انسانیت کا سبق سناتے ہوئے فرمائیں گے ـــــ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کرو اور یوں ہم سب فری میں کڈنیپ۔ کیا سمجھیں اپیا؟؟"

عانیہ نے سنجیدگی سے کہا تو عائنہ ہونق ہوگئی۔ سچ تھا وہ اپنی عمر سے زیادہ دور تک سوچتی تھی لیکن اس کی سوچ اور شخصیت میں کبھی نہیں بنی تھی، وہ کبھی عموماً خلیل جبران کو ذہن میں رکھ کر مگر عمل کرنے کی باری آتی تو اس کی سانس اٹکنے لگتی۔ یہ کالج ہی کی بات تھی کتنے مہینے وہ سب اس کی ہمت بڑھاتے رہے تھے۔

"کچھ نہیں ہوتا آپی! سب لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اب ہر شخص تو آپ کو اغوا کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوگا۔"

عالیہ کہتی۔ "اور کیا اپیا! اب ان کا ٹیسٹ اتنا بھی خراب نہیں۔" تو وہ بھنا جاتی اور یہ بھناہٹ، جھنجلاہٹ اور غصہ ہی تو تھا جس نے اس کو اتنی ہمت بخشی کہ وہ کالج جانے لگی ان سب کے مذاق کو غلط

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

ثابت کرنے کے لیے مگر دل ابھی تک پہلے دن کی طرح دھڑک اٹھتا تھا پھر اس معاملے پہ وہ کیسے یکدم سپر مین بن جاتی' حالانکہ سرتاپیر دل تا روح وہ ایک مکمل لڑکی تھی' بزدل اور دبو سی لڑکی سو آنکھیں خلا میں ٹکائے وہ غانیہ کو تکنے لگی۔

اور امینہ حاکم نے چٹکی بجا کر اسے چونکایا۔ ''عائنہ کیا سوچا پھر' یہ شخص تو قطعاً موزوں نہیں لگ رہا۔''

''پھر! پھر کیا کریں؟۔''

''بابا سائیں کو اپنا خدشہ بتاتے ہیں اور کیا کریں گے۔ جب ہم مطمئن نہیں تو بس۔''

''ٹھیک ہے میں بات کروں گی۔'' اس نے معاملہ ختم کر دیا' پھر رات گئے بابا سائیں سے یہ معاملہ ڈسکس کیا تو بابا سائیں خاموشی سے کتاب پر نظر جمائے بیٹھے رہے اور ماموں جان کھنکھار کے بولے۔

''مجھے عائنہ کا خدشہ بے بنیاد لگتا ہے بھائی جان! ضروری نہیں ہر گارڈ جیل سے چھوٹا قیدی ہی ہو' آپ نے اس کے کاغذات تو دیکھے ہی تھے ناں وہ ایک ریٹائرڈ فوجی ہے۔''

''اتنی سی عمر میں ریٹائرڈ؟ بابا سائیں کوئی تو وجہ ہو گی اس کی برخاستگی کی۔''

''نہیں کوئی خاص نہیں تھی۔ اچھا بھلا کمیشن مل گیا تھا مگر بس مزاج کی تیزی کے باعث کام خراب ہو گیا۔ ایک بار فائل خراب ہو جائے تو پھر اچھائی کی توقع نہیں مگر یہ پھر بھی لگا رہا' کیپٹن کے عہدے تک پہنچ گیا تھا کہ پھر زبردست چپقلش پر اس کی تنزلی ہو گئی۔ بس تب سے خار کھا گیا اور استعفیٰ دے دیا۔ کافی عرصہ تک اس کا کیس ہاٹ کیس رہا تھا' سب دوستوں کی اس کو ہمدردی و حمایت حاصل تھی مگر دل برا ہو گیا تو کسی کی نہ سنی۔''

''مگر بابا! یہ سب تو اس کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ آپ نے کہیں سے تصدیق کی اس کی؟؟''

''تصدیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے پاس تمام کاغذات موجود ہیں جو اس کی باتوں کو سچ ثابت کرتے ہیں۔''

''پر بابا سائیں! آج کل جھوٹے جعلی کاغذات بنانا کیا مشکل ہے اور پھر یہ کراچی ہے — بابا سائیں۔'' بابا سائیں نے غور سے دیکھا اور ماموں نے جھلا کر کہا۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو عائنہ؟۔''

''صرف اتنا ہی کہ مجھے اس شخص پر اعتبار نہیں' بابا سائیں! آپ نے اسے غور سے دیکھا ہے؟۔ آپ کو نہیں لگتا کہ ہم نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے بہت جانا پہچانا سا چہرہ ہے۔''

''ہاں' مجھے محسوس ہوا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا کہ کہاں دیکھا تھا مگر اسے ریجیکٹ کرنے کی یہ وجہ تو نہایت نامعقول ہے۔'' بابا سائیں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

——*

''کیا ہوا یہ تم اس قدر خاموش کیوں بیٹھے ہو؟۔'' سلمان حیدر نے ریسور رکھ کر نہایت خضوع و خشوع سے خاموشی کو خراج تحسین پیش کرتے ضمان حیدر سے سوال کیا تو وہ یوں چونک کر اسے دیکھنے لگا جیسے وہ ابھی تک یادداشت سے منہا تھا؟۔

''اب بول بھی چکو۔ کس کا فون تھا؟'' اس نے پھر سے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

''مسٹر حاکم سرور کا فون تھا۔ وہ کہہ رہے تھے انہوں نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔''

''یعنی ـــ'' چند لمحے رکا اور پھر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا پھر سرسراتے لہجے میں پکارا۔

''اب سمجھا' یقیناً'' یہی بات ہے نا جو میں سمجھا ہوں۔؟''

اس نے طویل سانس لی پھر سر ہلا کر بولا ''تم درست سمجھے یہ ہی وجہ ہے شہر بدر ہونے کی اتنی تکلیفیں اٹھانے کی اور یہ سیکیورٹی ایجنسی کھولنے کی۔ صرف اس شہر میں ایک اسی شخص کو تو ٹریس کرنا چاہتا تھا میں محض اس شخص کو تو میں ڈھونڈتا رہا ہوں کبھی پایا کبھی کھو دیا لیکن سنا ہے اب مسٹر حاکم سرور اسی شہر میں مقیم رہیں گے کیونکہ ان کا دل ڈیمیج ہو چکا ہے اور ہر وقت انہیں دیکھ بھال اور فوری ڈاکٹری امداد کی ضرورت رہتی ہے۔''

''تو؟؟''

''تو کیا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟؟'' اس نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

وہ آہستگی سے بولا ''صرف اتنا ہی کہ جو شخص خود مکافات عمل سے گزر رہا ہو' اسے مزید کانٹوں میں کھینچنا کہاں کا انصاف ہے۔''

''پتا نہیں یہ انصاف ہے یا نہیں لیکن ماں کے آنسو تم بھول سکتے ہو میں نہیں' جب تک ان کی آنکھوں میں اس جیسی برسات کی جھڑی نہ لگا دوں' مجھے چین نہیں آئے گا۔''

''میں نے دو تین دن سے تمہاری مصروفیات کا حساب لگایا ہے اور مجھ پر یہ راز آشکار ہے کہ وہ تم ہی تھے جو اس لڑکی کو تنگ بھی کرتے تھے۔''

وہ مزید آہستگی سے بولا ''ضمان! کیا یہ سب غلط نہیں۔ جنہیں تم واقعی تحفظ دے سکتے ہو۔ انہیں ہراساں کر رہے ہو۔ ان کے دلوں کو ہر پتے کے کھڑکنے پر خوف زدہ ہوتا دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے ؟؟''

''نہیں! مگر آج کل میں نے انسانیت کا سبق پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ چلتا ہوں۔'' کیپ جما کر وہ باہر نکل گیا۔

وہ خاموشی سے اپنے کام نمٹا رہا تھا مگر عائنہ حاکم مکمل طور پر اس پر مرکوز تھی۔ پتہ نہیں عائنہ حاکم کی آنکھوں میں اتنے شکوک کیوں تھے۔ وہ کافی دیر تک کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا پھر مؤدبانہ بولا۔

''کیا ہوا بیگم صاحب! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی؟۔''

عائنہ حاکم نے چونک کر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر کار سے اتر گئی اور وہ اسے کالج میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ سارے کام معمول کے مطابق ہی چلتے رہے۔ وہ وہیں کوارٹر میں رہ پڑا مگر جب بھی حاکم سرور کو دیکھتا اس کی آنکھوں میں سرخی بڑھ جاتی جسے وہ عینک کے پیچھے چھپا لیتا اور امینہ حاکم' عائنہ حاکم کے کان میں گھس کر پوچھتی۔

''یہ ہمارا گارڈ رات کے وقت بھی کالی عینک کیوں لگاتا ہے؟۔'' عائنہ حاکم کاندھے اچکا دیتی تو وہ بسور کر رہ جاتی پھر اچانک ایک دن اس نے یہی سوال خود اس سے کر دیا تو کتنی ساعتوں اس سے بولا ہی نہیں گیا پھر سنبھل کر بولا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے بی بی صاحب! یونہی روشنی اچھی نہیں لگتی۔'' پشت موڑ لی تو دل میں بڑبڑایا۔

''روشنی! واقعی بعض لوگوں کے چہروں پر روشنی اچھی نہیں لگتی' اس لیے ان چہروں کو تاریک کرنے سے پہلے تاریک دیکھنے کی خواہش اسی طرح پوری ہو سکتی ہے سو کر لیتا ہوں مگر حقیقت میں ان پر کالی رات نہ لایا تو کچھ نہ کیا۔'' عائنہ حاکم اس کے انداز میں عجب تحکم دیکھ کر گھبرا جاتی۔

''یہ گارڈ یوں نہیں لگتا جیسے کسی ایسی سلطنت میں آ گیا ہے جس کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں اور یہ اپنے زعم اور غرور کا پھریرا لہراتا اپنی فتح کے ڈنکے بجاتا ہوا حکومت کے لیے آ موجود ہوا ہے۔'' امینہ ہاں میں ہاں ملاتی۔

''ٹھیک کہتی ہو تم' اس کا انداز ملازموں والا نہیں حاکموں والا ہے۔ تمہیں پتا ہے ملازمت کے پہلے دن کیا کہا تھا اس نے ؟؟''

عائنہ سوالیہ ہو جاتی تو امینہ آہستگی سے کہتی ''کہتا تھا صاحب ہم یہاں ملازم ضرور ہوئے ہیں لیکن آپ ہم پر بے جا رعب مت ڈالنا ہم پوری ایمانداری سے نوکری کرے گا لیکن اگر ہمیں جانور سمجھ کر سلوک کرو گے تو ہم بھی پٹھان ہیں۔ دماغ گھوم گیا تو کچھ بھی کر بیٹھیں گے۔ صرف مجبوری نے یہاں لا پٹخا ہے ورنہ اعلیٰ تعلیم بھی ہے اور خاندانی نجابت بھی ہے ہمارے پاس۔''

''اچھا یہ کہا اس نے؟ بابا سائیں نے پھر بھی اسے رکھ لیا؟'' پھر فکر سے بولی۔

''امینہ! مجھے اس کا انداز بہت پراسرار لگتا ہے۔ پتہ نہیں عجیب طرح کا تحفظ ہے اس کی ذات میں' کبھی لگتا ہے چلچلاتی دھوپ میں بے سائبان ہیں اور کبھی لگتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہو گا تو ہر مصیبت پریشانی اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔''

''ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے یہ شخص۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہو جاتی تو وہ جوان کی باتیں

سنتا رہتا تھا روزانہ ہی ان کے خیالات پر ہنستا رہتا ان کے خیالات کی پاکیزگی چند لمحے کے لیے اسے روک روک لیتی لیکن ماں کا چہرہ یاد آجاتا تو اسے سب بھول جاتا۔

وہ اپنی مصروفیات میں لگا رہتا پھر چند ماہ ہی میں ان سبھوں نے دیکھا تھا کہ وہ بابا سائیں کا دست راست بن گیا تھا۔ گارڈ کے ساتھ ساتھ وہ ان کا مشیر بھی تھا اور بابا سائیں اس کی صلاح کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ ماموں یہ حالت دیکھتے تو کہتے۔

"عاصمہ! حاکم بھائی کو سمجھاؤ، کسی باہر کے آدمی پر اتنا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ سنتیں مگر کیا کہتیں۔ خاموشی سے بھائی کو اور اس کے مشورے کو دل میں وزنی محسوس کرتے ہوئے بھی خاموش رہتیں۔ بہت عرصے بعد تو ان کی شخصیت کو اعتبار اور مان ملا تھا پھر وہ کیسے اسے محض ایک اجنبی شخص کی مخالفت میں گنوا دیتیں اور یہ تو طے تھا انہیں اب تک اس شخص سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بس اس لیے خاموشی سے وہ تیل کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ تیل کی دھار کو دیکھے جا رہی تھیں اور وہ نیا گارڈ لفظوں کی بوند بوند سے بابا سائیں کے دل کو جیتے چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ اس گیم کا ٹرننگ پوائنٹ آگیا۔ اس نے نہایت مہارت سے عین پروگرام کے تحت گمنام فون کال کے ذریعے اغوا برائے تاوان کے عادی گروپ کو ہائر کیا اس شرط کے ساتھ کہ مزاحمت میں بھی قتل و خون نہ ہو۔ ہاں زخمی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی انتہائی صورت حال میں وقوع پذیر ہو، سو تمام کام حسب پروگرام ہی عمل میں آیا تھا۔ اس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ مجرموں نے اس پر فائر کھول دیا۔ یہ رسکی کام تھا مگر انتقام میں وہ دیوانہ ہو گیا تھا سو یہ بھی کر گزرا ایک گولی بازو چیرتی ہوئی گزر گئی تو وہ آگے پیچھے جھولتا ہوا سڑک پر ڈھیر ہو گیا اور عائنہ حاکم چلاتی گئی۔

"عظمی بھائی! ہائے عظمی بھائی! ارے ظالمو! میرے بھائی کا کتنا خون بہہ رہا ہے۔ پلیز چھوڑو مجھے، میں تیار ہوں تمہارے ساتھ جانے کو مگر میرے بھائی کو طبی امداد تو دلوا دو۔"

مگر ایک نہ سنی گئی اور وہ ان جملوں میں چھپی محبت کو اپنے اندر اترتا دیکھ کر بھی گونگا بہرا بن گیا۔

"بعض اوقات یہ نفرت ہر جذبے پر حاوی کیوں ہو جاتی ہے؟" زندگی نے پوچھا مگر وہ واقعی خون زیادہ بہنے سے بے ہوش ہو گیا تھا پھر آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل میں تھا اور بازو میں بے تحاشہ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"کیسے ہو بچے؟" بابا سائیں نے اتنی بے قراری اور محبت سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں میں بے سبب آنسو آ گئے مگر وہ انہیں پی گیا پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

"میں، میں بالکل ٹھیک ہوں صاحب! لیکن عائنہ بی بی کا اغوا میری کارکردگی کے منہ پر طمانچہ ہے۔"

"نہیں نہیں بیٹا! تم نے کوشش تو کی تھی ناں، سب کہتے ہیں تم نے اغوا کرنے والوں سے بھرپور معرکہ لڑا مگر ریوالور کے آگے کوئی کب تک ٹھہر سکتا ہے۔ بے فکر رہو۔ اس وقت شہر کی ساری پولیس عائنہ کی بازیابی کے لیے مصروف عمل ہے۔"

"مگر صاحب! یہ فرض تو میرا تھا نا مگر میں اسے نبھا نہیں سکا۔ میں پٹھان ہو کر بس ایک گولی سے بے ہوش ہو گیا۔ تف ہے مجھ پر۔"

"یوں نہیں کہتے بیٹا! سب ٹھیک ہو جائے گا گھبراؤ نہیں ویسے بہتر سمجھو تو گھر شفٹ ہو جاتے ہیں۔ گولی نے صرف بازو کا گوشت پھاڑا ہے ہڈی محفوظ رہی ہے بالکل پریشان مت ہو۔" لمحہ بھر کو تھمے پھر بولے۔ "پھر کیا خیال ہے تمہارا بیٹے؟"

"وہی جو آپ بہتر سمجھیں میرے لیے، آپ کی رائے افضل ہے صاحب۔" تھوڑا رکا پھر پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ "خدا کی قسم صاحب! جب تک عائنہ بی بی کو بازیاب نہ کروایا تب تک مجھے چین نہیں آئے گا۔"

اور پھر ان کے مشورے کے مطابق وہ گھر آگیا ایک دو دن آرام کیا پھر اگلے اسٹیپ کے تحت معلومات کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ بابا سائیں منع کرتے رہ گئے مگر وہ مجرم پیشہ اور بری شہرت پر اتنا بھی اعتبار نہ کرتا تھا جبھی جب سے عائنہ اغوا کی گئی تھی اس کا ایک بہت قریبی دوست حسن ان مجرموں کے درمیان عائنہ کا خود ساختہ محافظ بنا ہوا تھا۔ حسن کو اس نے اپنے خاص آدمی کے طور پر بھیجا تھا مگر حسن بھی میک اپ ہی میں تھا اور کالج کے زمانے کی اسٹیج کی سرگرمیاں اور اداکاری کا شوق اس کے بے حد کام آرہا تھا سو وہ حسن کی سلامتی اور عائنہ کے تحفظ کے لیے اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا پھر اس واقعہ کا پانچواں دن تھا جب پولیس نے رات کی خاموشی میں ریڈ کیا اطلاع حسن نے دی تھی عائنہ حاکم ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ باہر گولیوں کی دھائیں دھائیں ہو رہی تھی کہ ایک نقاب پوش اندر چلا آیا۔

"جلدی نکل چلو یہاں سے۔ وہ مجرم تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ تم نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی مثل سنی ہے ناں تو چلو فوراً میرے پیچھے چلی آؤ۔"

وہ اندھیروں کا سفر کرتا اسے روشنی میں لا کر غائب ہو گیا۔ وہ مین اسٹاپ پر کھڑی تھی اور با آسانی اپنے گھر جا سکتی تھی اس لیے اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی اور اپنی روٹ بس میں بدقت سوار ہو گئی۔ ٹیکسی یا رکشے کا وہ اتنی رات گئے رسک نہیں لے سکتی تھی کہ دودھ سے جلی ہوئی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ بابا سائیں نے کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا اور ماما اس کے ملگجے کپڑوں، اس کے انداز سے آنے والے کسی عذاب لمحے کو دل پر دستک دیتے ہوئے محسوس کر رہی تھیں پھر پولیس پارٹی ناکام و نامراد لوٹ آئی تو انسپکٹر راحیل سے بات بھی نہ ہو پا رہی تھی۔

"آئی ایم ساری سائیں! ہم نے اتنی احتیاط کی لیکن پھر بھی پتا نہیں وہ عائنہ بی بی کو ادھر ادھر کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔"

"عائنہ وہ تو گھر آ گئی ہے راحیل اظفر۔"

"جی۔ بی بی گھر آ گئی ہیں؟ آپ نے پہلے بتانا تھا ناں۔ پلیز ان سے ملاقات ہو جاتی تو بہتر تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا گروہ تھا جس کے فرنٹ سائیڈ پر ہم نے اٹیک کیا۔ وہ اگر کچھ معلومات بہم پہنچا دیں تو ہمارے لیے آسانیاں ہو جائیں گی اور مجرموں کی شناختی پریڈ بھی تو ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، سب ہو جائے گا۔ مجھے اس سے انکار نہیں مگر بچی ابھی لوٹی ہے۔ خوف زدہ ہے، تھکی ہوئی ہے۔ آپ کل آکر اپنی کارروائی مکمل کر لیجیے گا۔"

انسپکٹر راحیل اظفر سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور دوسرے دن وہ معلومات میں صرف ان مجرموں کو شناخت کرنے کے علاوہ کوئی اور کار گر بات نہ بیان کر سکی۔ اپنی گلو خلاصی میں اس نے جو واقعہ بتایا اسے انسپکٹر کی ذہانت نے آسانی سے ہضم نہیں کیا، اس کی آنکھوں میں شکوے تھے، جیسے لڑکی کسی کی شخصیت کو پردے میں رکھنا چاہتی ہے مگر عائنہ حاکم کی آنکھوں میں اتنی سچائی تھی کہ وہ زیادہ رد و قدح کر ہی نہ سکا اور کارروائی مکمل کر کے اٹھ گیا اور خود عائنہ حاکم تھی کہ "عظمت اللہ" کی دیکھ ریکھ میں لگ گئی تھی، اتنی محبت سے کہ کبھی ضمان حیدر کے اندر تبدیلی کسی منہ زور لہر کی طرح اس طرح بیدار ہوتی کہ اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہتا۔ مگر والٹ کھول کر ماں کی تصویر دیکھتا تو اس میں چھوٹے چھوٹے کئی الاؤ دہک جاتے۔

"ابھی تو کچھ نہیں کیا، ابھی تو سمندروں آنسو ہیں جو آنکھوں میں بھرنے ہیں، دکھ ہیں جو تمہارے نام کا حوالہ ہوں گے حاکم صاحب۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا اور ایسے مشورے دیتا بابا سائیں کو جو بظاہر سود مند اور خوب صورت لگتے مگر ان کے لیے مزید پریشانیاں خریدنے کا سبب بنتے اور ایسے میں وہ بڑھ کر بڑے دھڑلے سے اپنی غلطی مان لیتا مگر بابا سائیں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتے۔

"یوں مت سوچا کرو بچے! فیصلے درست اور غلط اس قدر ہماری زندگیوں پر اثر انداز نہیں ہوتے جتنا ہماری قسمت اثر انداز ہوتی ہے۔ تم نے جینئس افراد کو تاریکی میں ڈوبتے اور کسی گمنام کو شہرت کی بلندی پر پہنچتے نہیں دیکھا ہوگا مگر میں گواہ ہوں ایسے کئی لمحوں کا۔ سو بھول جاؤ جو فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوا اسے ہمارے لیے اسی حالت میں تخلیق کیا گیا تھا۔ یہی زندگی کا چکر ہے کیا سمجھے۔"

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

وہ خاموشی اختیار کرلیتا۔ زیر لب آئی مسکراہٹ دبا لیتا اور جب اپنی اینکسی میں لوٹتا تو حیران ہو ہو جاتا۔ کمراہ ہر وقت لشکارے مار رہا ہوتا اور تازہ گلاب محبتوں کے موسم کی طرح اردگرد ہلکورے لیتے رہتے مگر ہر جذبہ ٹکرا کر اس میں سیندھ لگائے بغیر آگے بڑھ جاتا اور وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر اپنی مضبوطی پر خود ہی کو داد دیا کرتا مگر تھکن نجانے کیوں وجود میں چنگاری کی طرح تیرتی پھرتی۔ کسی پربہارت کی آرزو کرتی، کسی نخلستان کی دعا مانگتی اور نظر پتہ نہیں کیوں عاصمہ بی کے اردگرد بٹ جاتی۔ ایسے کہ ماں کی یاد دل پر اور گہرا اثر چھوڑتی چلی جاتی اور اس کا بھی من کرتا کہ وہ بھی امیمہ اور عائشہ حاکم کی طرح ان کے گلے سے جھول کر فرمائش کرتا ان کی گود میں سر رکھے اپنی تھکن اتارتا مگر وہ یہاں محبتیں شیئر کرنے ہی کب آیا تھا جو واقعی اس راہ لگتا۔ نفرتیں جو دل میں لمحے سینت سینت کر رکھی تھیں وہ نفرتیں ان میں انڈیلنے آیا تھا اور آج کل جھنجلا اس لیے بھی گیا تھا کہ سلمان نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا پہلے تو اس نے یہی سمجھا یہ عام سی ناراضگی ہے مگر جب بات کرنے کو ترس گیا نہیں وہ عام باتیں تو ہر کسی سے کر سکتا تھا بلکہ ٹائم پاسنگ والی کئی دوستیاں اس نے یہاں مختصر قیام کے دوران ہی بنالی تھیں مگر خاص اور دل کی باتیں تو کسی ایک اور خاص ترین بندے ہی سے کی جا سکتی تھیں اور بس یہی کمزوری تھی اس جیسے مضبوط بندے کی کہ سلمان حیدر اس کا خاص ترین تھا زیادہ دن برداشت نہ کر سکا تو اس نے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔ سلمان حیدر ٹھس بیٹھا رہا ایک لفظ نہیں بولا اور ضمان حیدر جاں کنی سے اسے تکتا چلا گیا۔ اس نے پھر بھی توجہ نہ دی تو چلا اٹھا۔

"تمہیں معلوم ہے تمہاری ناراضگی میری ذات کا سب سے بڑا ویک پوائنٹ ہے اس لیے ہی تم مجھے کچوکے دے رہے ہو؟" اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا پھر آزردگی سے بولا۔

"بابا کہا کرتے تھے صرف دو انسان زیادہ چلایا کرتے ہیں ایک وہ جنہیں علم ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں۔ وہ حقیقت نہیں سو وہ بات میں دم پیدا کرنے کے لیے شور کرتے ہیں اور ایک وہ جن کے اندر باہر سے زیادہ شور ہو اور وہ اندر کی نفی کرنے کے لیے لاؤڈ ہوتے ہیں اور تم! مجھے تم دوسرے شخص لگتے ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔" سلمان نے کوئی رد عمل نہیں دیا اور کتاب اٹھالی اور جیسے کتاب سے مخاطب ہوا۔ "ہمیں یا تو سچ مان لینا چاہیے یا جھوٹ بولنا اتنی مہارت سے آنا چاہیے کہ ہم سچ کو اتنی ہی فورس سے جھٹلا سکیں۔"

"تم ان ڈائریکٹ کیوں بول رہے ہو؟ ڈائریکٹ بات کیوں نہیں کرتے مجھ سے؟"

اس نے ماما پاپا کی تصویر پر نظریں اور ٹکادیں آہستگی سے بولا۔ "جنہیں ہم اہم سمجھتے ہیں کوشش کرتے ہیں ان کو کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے مگر اس کو کیا کہیں گے اگر کوئی شخص اپنے ہاتھوں سے اپنی راہ میں خار بچھائے اور ٹوٹے ہوئے کانچ پر چلنے کی سعی کرے کیا کہتے ہیں اسے.....؟"

ضمان تھک کر صوفے پر گر سا گیا اور سلمان حیدر بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا پھر فضاؤں کو مخاطب کرکے بولا۔

"میں نے بہت چاہا۔ میں تمہیں روک لوں مگر تم نہیں رکے اس خار خار راستے پر چلنے سے پھر اب کیوں آئے ہو میرے پاس زخم دریدہ ٹوٹے ہوئے؟"

مڑ کر اسے دیکھا پھر پوری سچائی سے بولا۔

"دل کے موسموں سے بغاوت کرنے والے زیادہ دیر پیروں پر نہیں چلا کرتے ضمان! ایسے لوگ بہت جلد زندگی کے صحرا میں بے دم ہو کر گر جایا کرتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا جو ان کے پیاسے حلق میں محبت کی چھاگل سے رس پٹکائے۔ محبت دوا نہیں مگر پھر بھی محبت دل میں کسی جوہڑ کی طرح ٹھہری رہے۔ جمی رہے تو کائی بن جاتی ہے پھر اس کا ہر قطرہ سم بن جاتا ہے مگر افسوس تم نے یہ سچائی تسلیم کرکے ٹھکرا دی۔"

ضمان حیدر اسے دیکھتا رہا پھر جوشیلے انداز میں اٹھا اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا اور چلایا۔

"صرف میرا قصور ہے اس سارے معاملے میں؟ کیا صرف میرے جرم، میری خطائیں ہیں مانی! بولو! کیا

واقعی میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ثابت کر رہا ہوں؟"

سلمان حیدر اسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر دھیرے سے بولا۔

"جرم کسی کا بھی ہو ضمان حیدر! مجرم، خطاکار تم بھی ہو۔ تمہیں کیا پتہ بھائی کا لفظ محض لفظ نہیں، امید، تمنا اور خواہش ناتمام کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ دعائے نیم شبی کی قبولیت کا سامزا رکھتا ہے۔ اس معاشرے میں عورت کے لیے تحفظ کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں جس قدر بھی بہادر بن جائیں، کتنی ہی خود مختار ہوں مگر انہیں بھائی، بیٹے، باپ اور شوہر کے نام کی اس ناقابل تسخیر دلیل کی ضرورت ہوتی ہے مگر تم نے، تم نے بھی یہ مان توڑ دیا۔ تم جو ان کی روح سے تشنگی کے کانٹے چن سکتے تھے تم نے ان کی روح کو کانٹوں میں کھینچ لیا۔ لہولہان کر دیا، محض ان کے باپ کی کسی غلطی کی سزا میں۔ تم نے کبھی سوچا ہے ضمان! وہ لڑکی جو چار پانچ دن بعد بازیاب کرائی گئی ہے۔ اس کے متعلق اخبارات نے کیا کیا لکھا اور اس کے لیے لوگ کیا کیا کہتے ہیں۔ اسے کالج سے مائیگریٹ کرنا پڑا ہے مگر یہ طعنے ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ساری زندگی خوشی کو پورے نہیں کر سکے گی۔ وہ میری کچھ نہ سہی پر تمہاری تو بہن تھی مگر تم نے، تم نے کیا کیا اس کے ساتھ۔ اسے دنیا کے سامنے ایک اذیت بنا دیا ہے۔ تم پھول کھلا سکتے تھے گلاب مگر ضمان! تم نے ببول اگا دیے ہیں اور وہ پھر بھی تمہیں اپنا بھائی اور جانے کیا کیا تسلیم کرتی ہے۔ بہنیں بہت کمزور، بڑی پیاری سی عنایت ہوا کرتی ہیں ضمان! لیکن تم نے خود تو اس نعمت کا کفران کیا۔ مجھ سے بھی اس دھوپ دھوپ زندگی میں موجود سایہ چھین لیا۔ تم نے اپنا نہیں میرا بھی نقصان کیا ہے ضمان! پھر بھی کہتے ہو میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ کیا واقعی مجھے احتجاج کا بھی حق نہیں۔۔؟"

کہتے کہتے اس کی آواز روہانسی ہو گئی اور وہ اسے دیکھے گیا۔ جواب ایک بات کا بھی نہ تھا۔ سو فلیٹ سے نکلتا چلا گیا، پھر بابا سائیں کا بھیجا تھا جس نے اس حادثے کے چھ ماہ بعد بابا سائیں کے سامنے عائشہ حاکم کے لیے اپنا انتخاب لا رکھا۔

"یہ شخص کون ہے صاحب؟" اس نے مشورہ لینے پر آمادہ حاکم صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور وہ تفکر سے بولے۔

"میرا بھتیجا ہے، مگر عظمی! میں نے اس کے متعلق کچھ زیادہ اچھی خبریں نہیں سن رکھیں۔"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا اس بابت؟"

"پتہ نہیں۔ میری تو عقل ٹھپ ہو گئی ہے بچے! اس کی شخصیت کی کجی کو دیکھتا ہوں تو دل نہیں چاہتا مگر عائشہ کے اغوا کے بعد کی صورت حال دیکھتا ہوں اور آئندہ کا منظر نامہ تخلیق کرتا ہوں تو یہ انتخاب زیادہ بہتر لگتا ہے۔ گھر کا لڑکا ہے۔ خاندان کی عزت کو عزت سمجھے گا۔ ایک بار دھوپ میں ڈالے گا تو ایک بار چھاؤں میں بھی رکھے گا۔"

"یعنی آپ فیصلہ کر چکے ہیں، پھر آپ مجھ سے کیا مشورہ چاہتے ہیں؟"

"پتا نہیں، میں کوئی فیصلہ کر چکا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں، یا اس بات کا خواہاں ہوں کہ تم مجھے اس فیصلے سے سختی سے منع کر دو۔ سچ پوچھو تو بچے! اس لمحے واقعی مجھے ایک بیٹے کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر میرا کوئی دست راست ہوتا تو شاید یہ دردناک واقعہ ہوتا ہی نہیں اب بہنوں کا کوئی ایک بھائی بھی ہوتا ناں تو میں سکون سے آنکھیں بند کر سکتا کوئی ہوتا جو ان کا تحفظ بن جاتا۔"

"مطلب آپ بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں کو ترجیح دینے والے ہیں۔" بابا سائیں نے نظر اٹھا کر دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"یہ سچ ہے عظمی! میں اس سے منکر نہیں ہو سکتا، نہ یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے عظمت کے سنگھاسن پر بٹھا کر پوجو اور سمجھو میں انسان کے روپ میں فرشتہ تھا۔ فرشتے دنیا میں کہیں نہیں ہوتے کیونکہ ہم سب انسان ہیں عام سے، کمزور سے انسان۔ اور میں، میں ان عام انسانوں میں سے زیادہ عام انسان تھا۔ میری نظر میں زندگی محض لذت کام و دہن اور وجود سے آگے کچھ بھی نہ اس کے بعد کچھ۔ میں نے زندگی کو جی بھر

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

کر انجوائے کیا تھا کہ اچانک مری زندگی میں عاصمہ داخل ہوگئی' خوشبو کی طرح پر تاثر اور سبک عاصمہ۔ میں نے زندگی کے اصل لمحے ان دنوں گزارے' میں جیا بھی ان ہی دنوں تھا مگر یکے بعد دیگرے بیٹیوں کی آمد نے مجھے اس سے متنفر کردیا لیکن اب سوچتا ہوں تو یہ سب میرے دل کی ایک موہوم برائی کی ہلکی سی رمق تھی جس نے عاصمہ کا اور مری بچیوں کا چہرہ کملا دیا۔ عظمی! یہ سچ صرف میں تم سے شیئر کررہا ہوں کہ اگر عاصمہ صرف بیٹیاں مرے ذمہ نہ لگاتیں میں تب بھی اتنا ہی برا ہوتا۔ برائی مرے ڈی این اے میں شامل تھی کیونکہ ہمارے خون کا یہی تو خاصا تھا زور ہو' طاقت ہو حکمرانی ہو' تو کون کافر ہوگا جو اپنے دماغ میں رہے گا۔ بس یہی اختیار اور طاقت کا کھیل تھا جو میں نے سدا کھیلا۔ کتنے چہرے میری زندگی میں آئے مگر کوئی بھی ان میں سے نہ مجھے جیتا دے سکا نہ مجھے باندھ سکا۔ عاصمہ کو بھی محض اس لیے میں نے طلاق نہیں دی تھی کہ شاید مجھے لگتا تھا عاصمہ نے مجھے محبت کی مدھ چکھائی تھی۔ پتہ نہیں میں جن دنوں محبت کو خرافات اور خلل دماغی گردانتا تھا تب بھی میں نے محبت پر جب بھی سوچا عاصمہ ہی میری سوچ کے کینوس پر پھیلتی چلی گئی۔ دل کے کہیں اندر اسپارکنگ کرتی ہوئی' نہیں معلوم اس سے اس انسیت' محبت کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری پانچ بیٹیوں کی ماں تھی یا شاید یہ کہ زندگی کے اولین دنوں میں' میں نے جس چہرے کو غور سے دیکھا اور صنفی کشش سے ہٹ کر کچھ بہت اچھے جذبے اس کے نام کیے وہ عاصمہ تھی۔ اور مرد ہو یا عورت پہلی محبت' پہلی توجہ بھری نظر کبھی نہیں بھولتا سو میں بھی اس نظر سے بندھا یہاں چلا آیا۔ میں سراپا بدل گیا ہوں' بدل گیا تھا عظمی! بیٹے' بیٹی کا تقابل اور خواہش بھی کہیں اندر جا سوئی تھی مگر اس نے سیٹ اپ میں میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی واقعی ہوتا میرا دست و بازو بننے والا انہیں تحفظ دینے والا ان کا ماں جایا کوئی ہوتا۔"

وہ خاموش ہوگئے تو اس نے آنکھیں جھکالیں۔ پتہ نہیں ان آنکھوں میں آج پھر سے سرخی کیوں دوڑ گئی تھی۔ وہ جو سلمان کی باتوں سے پگھل گیا تھا' پھر سے اس بات پر کیوں چٹان ہوگیا تھا کہ اس داستان میں اس کی ماں کا تذکرہ تو ایکس وائی زیڈ کی حیثیت سے بھی نہ کیا تھا حاکم صاحب نے اور ایک اس کی ماں تھی کہ حیدر کے نام کی چادر اوڑھ کر بھی کبھی کبھی خاموشی سے اس سنگ دل انسان کے لیے رویا کرتی تھی شاید ان کی بھی یہی مجبوری تھی کہ اس شخص کا چہرہ ان کی زندگی کا اولین چہرہ اور محبت کا پہلا احساس لیے ہوئے تھا۔"

وہ سر جھکائے سوچے جارہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ اچانک بابا سائیں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"بولو بھی عظمی! تمہاری صائب رائے کیا ہے' تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔" اس کا دل چاہا کہے۔

"عائنہ اب اتنی بھی ارزاں نہیں کہ "ہاشم نصیر" کو اس کی زندگی اور قسمت کا مالک بنا دیا جائے جو جرم اس کا تھا نہیں اس کی سزا بھی اسے کیوں ملے دنیا میں ہر شخص کے لیے اس کا دوسرا گمشدہ حصہ بھی تخلیق کیا گیا ہے۔ سب کے جوڑے بنائے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عائنہ حاکم کی زندگی کا اصل ہم سفر اس کی حاجت لیے اس کے در پر دستک نہ دے۔ یہ انتظار جاں گسل ضرور تھا مگر ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ انتظار شرط تھی اور عائنہ حاکم جیسی پیاری لڑکی کے لیے انتظار ہی بہتر تھا۔ کبھی نہ کبھی تو زندگی مہربان ہوتی۔"

وہ بڑھ کر یہ بھی کہنا چاہتا تھا۔

"بابا سائیں ادھر دیکھیے میری طرف میں آپ کے عمل کے رد عمل میں کس قدر برا بن گیا ہوں کہ اب خود کو نہیں پہچان سکتا مگر دیکھیے آپ کی طرح اب تک میں بھی نیک نام ہوں۔ ملنے جلنے والوں' دوستوں میں کولیگز میں معتبر اور با اعتبار ہوں اور ایک وہ معصوم لڑکی ہے' وہ کتنی بے اعتبار اور کتنی ارزاں کردی گئی ہے۔ مجرم ہم دونوں ہیں سزا صرف اسے تنہا ملے گی؟ ہم دونوں کو پھانسی ملنی چاہیے۔ قتل وجود کا' ہو ذات کا ہو' قتل تو قتل ہوتا ہے ناں۔"

مگر وہ یہ سب سوچ کر بولا تو دل کے برخلاف اچانک ہی ماں کی آنکھیں اس کے دل پر آنسو ٹپ ٹپ کرکے برسانے لگی تھیں۔ وہ آنسو تھے کہ چنگاری۔ جہاں قطرہ ٹپکتا وہیں دل کی سرزمین پر ایک داغ پڑ جاتا دھواں اٹھنے لگتا اور اسی دھوئیں میں اس معصوم لڑکی کا چہرہ فیڈ آؤٹ ہوگیا اور وہ مدھم انداز میں بولا۔

"ٹھیک کہتے ہیں صاحب! آپ کا فیصلہ راست فیصلہ ہے' اس چوئیشن میں اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔"

بابا سائیں نے تھکے تھکے انداز میں اسے دیکھا جیسے مان لینے کا جو ارادہ باندھا تھا دل نے' اس سے ہٹ کر دیے جانے والے مشورے نے انہیں دھچکا پہنچایا تھا مگر یہی حالات کے پیش نظر بہتر تھا سو انہوں نے حامی بھر دی۔

ماموں نے سنا تو تڑپ کر رہ گئے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں بھائی صاحب! عاصمہ! تم انہیں سمجھاؤ۔ اس فیصلے سے انہیں روکو' یہ سب ہونے سے کہ تم سے زیادہ بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ روح کی درماندگی اور ناپسند زندگی گزارنے کی اذیت' اپنی محبت کے بدلے نفرتیں پانے کی ذہنی اذیت۔ عاصمہ! سمجھاؤ انہیں۔" کہتے کہتے رکے پھر آہ بھر کر بولے۔

"کاش اس وقت میرا کوئی بیٹا ہوتا تو عائنہ بیٹا کے لیے میں سینہ سپر ہوجاتا' لڑ جاتا اس کی خوشیوں کے لیے مگر وائے افسوس"

دکھ یہاں سے وہاں لہجے کی طرح آنکھوں میں بھی در آیا۔ عاصمہ حاکم نے بھائی کی باتوں اور اپنی طویل ازدواجی زندگی کی خزاں رسیدہ شاموں سے جو اذیت کشید کی اس کا حساب کتاب لگایا تو برملا حاکم صاحب کے سامنے ڈٹ گئیں مگر ان کی ایک نہ چلی فیصلہ وہی ہوا جو بابا سائیں نے کیا اور امینہ جو تھی اس کو جھنجھوڑ کے بار بار یہی کہتی تھی۔

"تم لڑو عائنہ! اپنے حق کے لیے لڑو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے' کہاں کا انصاف۔"

اور عائنہ حاکم ہتھیلی آگے پھیلائے اس سوال پر گم صم رہ جاتی۔ انصاف تو سدا سے یہی رہا ہے۔ لڑکیوں کے نصیب تو چھدری چادر ہیں کہ دھوپ چھن چھن آتی ہے۔ پیوند لگائے' تب بھی کوئی نہیں جو ان کی ذات کے کاسے میں اعتبار' بھرم اور مان کے سکے اچھالے۔ وہ ساری زندگی یونہی تہی دست رہتی ہیں' خالی ہتھیلی کی طرح خالی خالی' تن من دونوں سے مسافتیں سمیٹ کر کسی جاہ' کسی منزل پر پہنچ جائیں تب بھی انہیں اپنے لیے کوئی لمحۂ قرار' لمحۂ معتبر نہیں ملا کرتا۔ سامنے دھول اڑاتا راستہ ہوتا ہے اور پیچھے زخم زخم راستے کی یادیں اور ساتھ ہوتا ہے دریدہ درماندہ لہولہو وجود۔

"تم چپ کیوں ہو عائنہ! تم پڑھی لکھی ہو' بابا کے سامنے جاؤ اور لڑ کر کہو تمہیں یہ فیصلہ منظور نہیں۔ جس جرم میں تمہارا قصور نہیں اس کی سزا بھی تمہیں کیوں ملے تم۔ تم ہاشم نصیر جیسے بے سمت اور بے مہر انسان کے لیے نہیں بنی ہو' تمہارے لیے تو کوئی بہت پیارا انسان آئے گا۔ ہاں عائنہ! سچ کوئی بہت پیارا انسان' جس کے پاس تمہارا پتہ ہوگا اور تمہاری طلب مگر جسے ابھی تک تمہارے گھر کا راستہ نہیں ملا ہوگا مگر وہ محو سفر ہے اب بھی' ایک تمہاری آس کو دل میں بسائے تمہاری طلب میں محو سفر بائی گاڈ۔" وہ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ موڑ کر اسے یقین دلاتی رہتی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ کالج جانا چھوٹ چکا تھا۔ وجہ بابا سائیں نہیں تھے۔ وہ شہرتیں تھیں جو اخبارات کے ذریعے سارے کالج میں منہ میں انگلی ڈالے ہر وقت اس پر کف افسوس ملتی رہتیں اور تذلیل کے نئے نئے انداز سے اس پر زہر افشانی کرتیں۔ اب اس کی زندگی صرف گھر' کچن یا گارڈن تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کتابیں اور آگے پڑھنے کا عزم اس نے الماری کے سب سے نچلے خانے میں مقفل کردیا تھا اور چابی لاپروائی سے گم کردی تھی اور گھنٹوں سوچا تھا کہ کاش اذیت انگیز یادوں کو بھی ایسے ہی کہیں مقفل کرکے چابی گم کردینا آسان ہوتا تو زندگی کتنی سہل ہوتی مگر یہ طے تھا اسے یہی مشکل زندگی گزارنی تھی۔ سو اس نے خود کو اس زندگی کے لیے ریزہ ریزہ کرکے پھر سے جوڑ لیا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بابا سائیں نے منگنی کی رسم کی تاریخ دے دی تھی اور امینہ بھرے دل سے اس کے لیے شاپنگ کر رہی تھی بقول بابا کے منگنی ہی سہی حاکم صاحب کی پہلی اولاد کی خوشی تھی اور وہ اپنے سب ارمان نکالنا چاہتے تھے۔ یہ اور بات کہ سارے گھر میں ماتمی فضا طاری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منگنی کا دن بھی آ گیا۔ عائنہ حاکم سفید کامدار شرارہ سوٹ میں اداس کہانیوں کا اداس روپ بنی بیٹھی تھی اور ستون کے پیچھے کھڑے ضمان حیدر کا دل یکدم ہی اس کے ملیح و پُرملال حسن پر اندر ہی اندر تھرانے لگا تھا۔ ایک بوجھ سا تھا جو دل پر آ گرا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا اور کھڑی ماں کہیں قریب ہی اس کی سوچ پر کفِ افسوس مل رہی تھیں۔

”میری محبت میں میری ہی صنف پر قہر الٰہی کیوں؟ یہ میری نہ سہی پر ہے تو تیری بہن اور بہنوں کے قدموں اور راستوں میں آنے والے خار تو بھائی پلکوں سے چنا کرتے ہیں مگر ضمان! تو نے یہ کیا کیا؟ کیوں کیا ؟؟“

دل گھبرانے لگا تو وہ باہر آ گیا۔ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ دل ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ عین اسی وقت لینڈ کروزر پورچ میں رکی۔ تین چار باڈی گارڈ اور دو دوستوں کے ساتھ ہاشم نصیر اتر رہا تھا۔ لمبا چوڑا ہاشم نصیر جس کے چہرے پر سختی، درشتی اور کردار کی خامی خود بخود منعکس ہو رہی تھی چہرہ واقعی دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ مگر وہ عائنہ حاکم اس کا کیا قصور تھا چھوٹی سی معصوم سی عائنہ حاکم کا کیا ہوگا، وہ اس شخص کے لیے تو نہیں بنی اس کے لیے تو کوئی بہت پیارا انسان ہونا چاہیے کوئی بہت ہی پیارا انسان۔“

وہ واپس پلٹا مگر رسم کا اعلان ہاشم نصیر کے بیٹھتے ہی ہو چکا تھا۔ وہ ستون پر بے ساختہ مکا مار تا رہ گیا اور عائنہ حاکم تھی کہ سراپا حسرت بنی اس کو تک رہی تھی۔

”تم میرے محافظ تھے، میرے بھائی تھے مگر تم نے ہی مجھے دار چڑھا دیا۔“

”نہیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ اس سے کس نے کہا میں اس کا بھائی ہوں؟ اسے کیونکر علم ہو سکتا ہے کہ اس کا میرا خون کا رشتہ ہے ؟؟“

پشت موڑ کر سوچا مگر وہ سوال، وہ شکوہ کیا تھا جو اس کی پلکوں میں آ اٹکا تھا۔

”عائنہ حاکم! میں کتنا برا ہوں ناں۔“

مڑ کے اس نے دیکھا مگر عائنہ حاکم کا سر جھکا ہوا تھا، شاید یہ سر اب ہمیشہ ایسے ہی جھکا رہے گا۔ لوگ تو محبت میں کبھی کبھی خدا ہوتے ہیں مگر یہ شخص جو اس کے برابر بٹھا دیا گیا، ایک اس کی انتقامی کارروائی کے تاوان میں، یہ شخص تو سرتاپیر فرعون ہے۔ تو کیا عائنہ حاکم کا سر کبھی سجدے سے اٹھے گا ہی نہیں۔ رو پہلی زنجیریں اس کے پیروں میں، ہاتھوں میں اور روح کے گرد حصار ہو چکی تھیں اور یہ سب کچھ بہت دیر تک دیکھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ سو وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ سگریٹ پیتا، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر سرگشتی کرتا تھک گیا تو رکشہ کر کے واپس فلیٹ لوٹ آیا۔ سلمان حیدر نے دروازہ کھولا مگر توجہ تک نہیں دی۔ آہستگی سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اندر چلا آیا۔ سارا فلیٹ اسی طرح قرینے سے تھا بس ایک اس کی زندگی بے قرینہ ہو گئی تھی۔

”کیسے ہو تم؟“ اجنبی بن کر کسی اپنے سے ملنا جس قدر بھی اذیت انگیز سہی مگر کم اذیت انگیز یہ بھی نہیں کہ جب کوئی اپنا اجنبی بن کر بھی آپ کو جواب دینا ضروری نہ سمجھے، کتنے لمحے تک دل سنبھالتا ہے نا آپ کی حساسیت۔ سو وہ بھی بت بنا کتنی دیر تک سلمان حیدر کو تکتا رہا پھر ڈھیٹ بن کر آگے بڑھا اور اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

”ناراض ہو ابھی تک؟“ سلمان حیدر نے پھر کچھ نہ کہا۔ واپس بیڈ پر آ بیٹھا۔ ضمان حیدر کی روح آنکھوں میں کھنچ آئی! ایک طرف عائنہ حاکم ناراض کھڑی تھی اور ایک طرف یہ شخص روٹھا بیٹھا تھا جو دنیا میں اسے بہت عزیز تھا۔

”سلمان! او مانی! ادھر دیکھ کیا واقعی ناراض ہے ؟؟“

”نہیں، بہت عرصہ ہوا، یہ درد سر میں نے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ ہر شخص یہاں اپنے اصولوں، ضابطوں پر جیتا ہے پھر میں کون ہوتا ہوں جو تم سے تمہاری زندگی پر سوال جواب کروں۔“

”حکومت۔ ایک تم ہی تو ہو میرے اپنے۔“

”ہاں، یہ خوش فہمی بھی کبھی تھی مگر اب یہ بھی نہیں۔ تمہارا کیا ہے ضمان حیدر! خدا جانے تم کب بدل جاؤ۔ کب تمہیں اپنی محبت حماقت لگنے لگے اور تم میرے لیے بھی ایسے ہی خار بھرے راستے تجویز کر دو جس پر مجھے برہنہ پا چلنا پڑے۔ تمہاری دشمنی قبول کی جا سکتی ہے مگر تمہاری دوستی نو ضمان حیدر! نو۔“

اس نے کمبل اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا اور روکھے لہجے میں بولا تو وہ بیڈ پر اس کے قریب چلا آیا پھر چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

”ادھر دیکھو، کیا واقعی میں اتنا برا ہوں ؟؟“

”آئی ایم ساری، میں نے عرصہ ہوا اچھے برے ہونے کا پیمانہ توڑ ڈالا ہے ڈیئر! میں اب کسی کو اس کسوٹی پر نہیں پرکھتا کیونکہ یہ دنیا جادو کا کھلونا ہے یہاں ہر اچھا شخص برا بھی ہو سکتا ہے اور برا شخص اندر سے اچھا بھی نکل سکتا ہے اور مجھے! مجھے ماسک پہ سے ماسک اتارنے کا فن نہیں آتا۔“

”طنز کر رہے ہو؟ کیا واقعی میں اتنا برا ہو گیا ہوں مانی؟“ وہ روہانسا ہو گیا۔

مگر سلمان نے پھر ایک لفظ نہیں کہا اور وہ پھر سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دل چاہ رہا تھا وہ ہاتھ تھام کے روک لے مگر اس نے بڑھ کر دروازہ اس کے احتجاج سے پہلے ہی کھول ڈالا تو دل زلزلے کی زد میں آ گیا۔ اسے محسوس ہوا وہ اس فلیٹ سے ہی نہیں اس کے دل سے بھی نکلتا چلا گیا ہے ہمیشہ کے لیے اور اب اسے یونہی خاک بسر دربدر پھرنا تھا بے خانماں برباد سا۔ اس نے بند ہونے والے فلیٹ سمیت دل کے دروازے پر حسرت سے نظر ڈالی، آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر دھکیلا اور واپس کوٹھی لوٹ آیا۔ اور بابا سائیں تھے کہ اس سے پوچھ رہے تھے، وہ کہاں چلا گیا تھا۔

”میں یہیں تھا صاحب! بس کچھ طبیعت میں گرانی سی تھی اس لیے باہر چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔“ بابا سائیں مطمئن ہو گئے تھے اور وہ ملازمین کے سر پر کھڑا گارڈن کی آرائشی اشیاء گاڑی پر لوڈ کروا رہا تھا کام سے نمٹا تو ٹیکسی کی طرف جاتے ہوئے بے سبب اس کے قدم عائنہ حاکم کے کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے ہلکی ہلکی مدھم روشنی باہر جھانک رہی تھی اس نے ہولے سے دروازہ کھولا مگر وہ متوجہ نہیں ہوئی۔ لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور اردگرد گجروں کے سرخ پھول پتی پتی بکھرے پڑے تھے۔ اسے لگا جیسے دل ریزہ ریزہ کے ٹکڑے ہوں اور وہ مگن تھی کینوس پر رنگوں سے لکیریں کھینچنے میں دل چاہا پکارے ”عائنہ حاکم ادھر دیکھو۔ کیا تمہیں لگتا ہے تمہارے اس بھائی کے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں اندھے کنوئیں میں دھکیل سکتا ہے۔“

مگر نظر واپس اپنی طرف لوٹی تو آواز اندر ہی کہیں کھو سی گئی کہ اس کے ہوتے ہوئے کیا خود اس نے عائنہ حاکم کو اندھے کنویں کی صدا بنا دیا تھا جس کی تھاہ تھی نہ منزل، وہ الٹے پیروں واپس لوٹ آیا۔ بستر پر لیٹا تو ساری رات خود سے لڑتا رہا سو صبح جاگا تو شکست خوردہ سا وجود لیے ہوئے تھا بستر سے ملنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ہر چیز بری لگ رہی تھی جب ہی ایک ملازم اسے اٹھانے چلا آیا۔

”صاحب! بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ بچیوں کو اسکول نہیں لے کر جانا کیا؟“ سوال بھی داغ دیا تو اس نے بند آنکھیں بدقت کھولیں۔

”میری طبیعت کہتے کہتے یکدم رک گیا۔ ”چلو میں آتا ہوں۔“ پھر اس کے جاتے ہی منہ ہاتھ دھو کر بخار میں پھنکتا ہوا وجود لیے پورچ میں جا کھڑا ہوا۔

ثمرہ نے دیکھا تو بڑے دلار سے سلام جھاڑا۔

”السلام علیکم عظمی بھائی۔“ اور وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ ننھی عائنہ حاکم اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے۔

”کیا دیکھ رہے ہیں عظمی بھائی ؟؟“ دھیرے سے پوچھا یا تو وہ مسکرانے لگا بے سبب اور دل تھا کہ اندر روئے گیا تھا۔

”کتنے پیارے پیارے دل ٹوٹ گئے۔ تم نے کیا

WWW.PAKSO

کمایا ضمان حیدر! صرف بد دعائیں۔" اور ثمرو اس کی خاموشی سے گھبرا کر اس کے قریب چلی آئی۔

"آر یو آل رائٹ عظمی بھائی۔" ہولے سے ہاتھ تھاما اور چیخ پڑی۔

"او مائی گاڈ۔ اتنا تیز بخار ہے آپ کو۔ آپ بستر سے کیوں اٹھے۔ آپ نے کوئی دوائی عظمی بھائی ؟؟"

اس نے تھک کر نفی میں سر ہلایا۔ سارے وجود میں سائیں سائیں تھی یا چیخیں تھیں جو گونجتی پھر رہی تھیں اسے بہت کم ہوش رہا تھا جب اس کی سماعت میں ثمرو کی آوازیں پڑی تھیں۔ اس نے ذرا کی ذرا دیر میں ہاہاکار مچا کر سب کو ہی بلا لیا تھا اور سب سے زیادہ پریشان ہونے والوں میں عائنہ حاکم پیش پیش تھی۔

"ثمرو ٹھیک کہتی ہے عظمی بھائی! اتنا زیادہ ٹمپریچر ہے آپ کو۔ چلیے میں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا لاؤں۔" اور وہ اسے دیکھے گیا بری شہرتیں اس کے نام تھیں وہ پھر بھی نیکی کے لیے ہمہ وقت پر تولے رکھتی تھی۔

"نہیں! میں خود چلا جاؤں گا۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور کسی حوالے سے اس تقدس بھرے رشتے کو رگیدے سو تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔ عائنہ' بابا سائیں سب پکارتے رہے مگر وہ رکا نہیں پھر چیک اپ کے بعد وہ پھر سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر بدقت لوٹ آیا۔ عائنہ حاکم' امینہ حاکم' عاصمہ بی' ثمرو اور باقی سب لڑکیاں اس کے لیے محو انتظار کھڑی تھیں۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے عظمی۔" عاصمہ بی نے بڑھ کر تفکر سے کہا تو اس نے آواز نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ معمولی ٹھنڈ ہو گئی ہے بیگم صاحبہ۔"

"یہ معمولی سی ٹھنڈ ہے عظمی بھائی؟ شکل دیکھیے کیسی زرد ہو رہی ہے۔" عائنہ حاکم نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے نسخہ لیا اور فوراً" ملازم بھیج کر منگوایا اور یوں اس کی تیمارداری کا دور شروع ہو گیا۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا اور خود اسے اپنے آپ سے حد درجہ چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے اس کے اندر محبت کا دیپ روشن ہو رہا تھا ویسے ویسے اسے کیے گئے اپنے عمل سے وحشت ہو رہی تھی اس لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ٹھیک ہوتے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لے گا اور ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا مگر ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک بھی نہ ہوا تھا کہ سلمان حیدر چلا آیا۔ اس کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی پورٹیکو سے ہی اس نے تھام لیا۔

"پلیز مائی! میں خود سب کہہ دوں گا تم یہاں میری پوزیشن آکورڈ نہ کرو۔"

"کیا مطلب؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟ آپ ہیں کون ؟؟"

"مائی ـــــ" حیرت کے شدید جھٹکے سے وہ ہل کر رہ گیا اور وہ ایک ناپسندیدہ سی نظر اس کے چہرے پر ڈالے اندر بڑھ گیا اس سے یہ سب ہضم نہ ہوا تو وہ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ آیا اور دیکھ کر حیران رہ گیا وہ سب لڑکیاں پہلے سے کان لگائے کھڑی تھیں اسے آتا دیکھا تو سب پزل ہو گئیں۔

"اوہ عظمی بھائی آپ۔" سب سے پہلے عائنہ حاکم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور فرار ہونے میں عافیت سمجھی پھر ایک کے بعد ایک وہ سب غائب ہو گئیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بابا سائیں کو ایک ماضی کی داستان سنا رہا تھا۔ ایک طلاق نامے کی کاپی' برتھ سرٹیفکیٹ' البم سامنے دھرے تھے اور وہ کہہ رہا تھا وہ داستان جس میں بابا سائیں نے ایک رئیس زادے کا رول پلے کیا تھا۔ ایک لڑکی سے شادی کی تھی پھر ایک ماہ بعد آنکھوں میں حیرت بھر کر کہا تھا۔

"کون شوہر؟ کیسا شوہر؟ نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟ گواہ لاؤ۔"

اور وہ لڑکی روتی رہ گئی تھی۔ اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اعتبار میں بہت بے دھڑک لوٹی گئی تھی مگر ماں باپ اور وہ خود اتنی غریب تھی کہ اس امیرزادے سے ٹکر نہ لے سکی اور متوقع بدنامی کے ڈر سے ہجرت کر گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی میں ایک دوسرا شخص آیا' بہت ایماندار پرمحبت ایسا کہ اس کے سارے دکھ چنتا چلا گیا اس شخص نے اس کے لیے قانونی جنگ لڑی اور حاکم سرور کو لکھ بھیجا کہ اگر تم اسے بیوی تسلیم نہیں کرتے تو اسے باندھے رکھنے کا فائدہ طلاق دے دو ورنہ خلع لینے میں تمہاری بدنامی

گی۔ سچ حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں۔ اس لڑکی کی جتنی بدنامی ہونی تھی ہو گئی اور اگر مزید بھی ہوئی' اس سچ کو منظر عام پر لانے میں تو میں تب بھی اسے اپنا لوں گا' اس لیے کہ جو شخص صرف جیتنے کے لیے کھیلے اسے شکست دینا آسان نہیں۔ کیا سمجھے۔"

اور دوسری طرف سے خاموشی سے طلاق نامہ آ گیا۔ وہ لڑکی سمندروں روئی اس طلاق پر' خوشی سے۔ عورت کے لیے یہ تازیانہ سہی مگر اس کے لیے تو اس کی پاک دامنی کا سرٹیفکیٹ تھا' اس کے نفس اس کی صنف کے معتبر ہونے کی سند تھا سو اس نے اس طلاق نامے کو محفوظ کر لیا اور چند ماہ بعد ہی اس کی شادی اس شخص سے ہو گئی جو اس کے لیے جنگ لڑ سکتا تھا اس کے لیے سینہ سپر ہونا چاہتا ہی نہیں بلکہ ہو بھی گیا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا تھا اس امیرزادے کو کہ جسے اس نے سب سے کم مدت اعتبار کے سنگھاسن پر بٹھایا تھا وہی اس کے لیے وارث تخلیق کرنے کا سبب بنائی گئی تھی۔ خواہش کی تکمیل کا سبب تھی پھر بہت ڈھونڈا اس نے مگر وہ لڑکی نہ مل سکی تھی اور اب برسوں بعد ایک نوجوان بیٹھا تھا پرانی داستان سناتا ہوا' زندگی کا نیا کردار بنا ہوا بابا سائیں یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے' ماموں' ممانی' عاصمہ بی محو حیرت تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔

"پھر سائیں کیسے نا۔ پسند آئی آپ کو ؟؟"

"کہانی؟ تم آخر ہو کون؟" بابا سائیں کتنی دیر بعد قوتیں مجتمع کر کے بولے اور وہ ہنس پڑا۔

"یہ نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں یہ پوچھیں کہ آپ کا وارث کون ہے؟ میرے خیال میں ثبوت ناکافی تو نہیں۔" وہ کہہ کر کھڑا ہو گیا تو بابا سائیں باہر تک اس کے پیچھے آئے۔ وہ رکا نہیں تو وہ تھک کر پلٹے ضمان حیدر ایک دم رک گیا۔ آنکھوں میں آئے آنسو وہ کسی طور نہ چھپا سکا اور بابا سائیں تھے ڈبڈبائی آنکھوں سے خارجی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے چارگی سے کہہ رہے تھے۔

"چلا گیا۔ عظمی چلا گیا وہ لڑکا' وہ جو میری ساری کج روی کا سبب تھا اگر اسے جانا ہی تھا تو وہ آیا کیوں تھا' کیا مجھے انتظار کے جاں گسل احساس کا شکار کرنے' مجھے علم نہیں تھا تو صبر تھا اب میں کیسے جیوں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ انہیں سہارا دیتا بیڈ روم میں لے آیا پھر بابا سائیں اس غم کو لیے بستر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ سلمان حیدر اکثر فون کرتا قہقہے لگاتا اور ضمان حیدر چیختا۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ کیوں ؟؟"

اور وہ لاابالی پن سے کہتا۔ "میری مرضی' تمہیں اداکاری کا شوق ہے کیا مجھے نہیں ہو سکتا۔"

یہ ڈرامے بازی یونہی چل رہی تھی کہ اچانک وہ لمحہ آ گیا جب اسے بہت شدت سے ضمان حیدر ہونا تسلیم کرنا پڑا۔ ہاشم نصیر' امینہ حاکم سے بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔ جب اچانک کسی کام سے اندر آتے ہوئے ضمان حیدر کے خون میں پارہ گردش کرنے لگا تھا گھر میں سوائے امینہ' عائنہ اور ثمو کے کوئی نہیں تھا۔ بابا سائیں صرف اپنے کمرے تک محدود تھے اور عاصمہ بی ابھی تھوڑی دیر پہلے حاکم صاحب کو سکون آور دوائی دے کر پڑوس میں میلاد میں گئی تھیں کہ یہ شخص اچانک چلا آیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" تڑخ کر اس نے سخت ترشی سے پوچھا اور اس شخص نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کان سے مکھی اڑائی ہو' پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔

"آ جاؤ' تم بھی آ جاؤ۔ یہ خانۂ بے تکلف ہے۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں اور بہرحال مفت سامنے ہو تو۔"

"شٹ اپ" پوری قوت سے تھپڑ اس کے چہرے پر کسی میکانکی عمل کے تحت ہی اس نے مارا تھا ورنہ وہ تو خود کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں' وہ صرف گارڈ ہے اور بس لیکن خون کا جوش رشتوں کی زنجیریں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ توڑ دینے سے واقعی ٹوٹ نہیں جاتیں وہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور ضمان حیدر کی آنکھوں میں قہر بانی تھی۔

"تم نے' تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟؟"

"تم کون ہو نہیں کوئی تھے' اسے یاد رکھو۔ آج کے بعد تم اس گھر کے لیے کچھ بھی نہیں ہو' یہ بھی مت بھولنا۔"

"بکواس مت کرو۔ تم کون ہوتے ہو فیصلہ صادر کرنے والے ؟"

"میں' میں اس گھر کا محافظ ہوں اور حق رکھتا ہوں فیصلہ کرنے کا۔"

ہاشم نصیر نے کینہ توزی سے دیکھا پھر شرانگیزی سے بولا "ان کا محافظ تو میں بھی بن سکتا ہوں!" وہ رکا پھر بولا "اپنے اطراف خوب صورتی کے بری لگتی ہے' مسٹر عظمت! ہاں بس تجھے دار باتیں بنانے کا ہنر آنا چاہیے۔ خوب عیش ہیں تمہارے۔ ایک نہیں بلکہ۔"

"آگے ایک لفظ مت کہنا' یہ سب میری بہنوں کی طرح ہیں۔"

"ہاہا۔ بہنیں۔" تمسخر سے کچھ اس طرح ہنسا کہ ضمان حیدر کا دماغ کنٹرول میں ہی نہیں رہا۔ وہ لڑ پڑا۔ دونوں جنگلی بھینسوں کی طرح ایک دوسرے کو رگید رہے تھے جب اچانک عاصمہ بی ہونق سی امینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو ؟؟"

"آپ! ہٹ جائیے بیگم صاحب! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ لڑتا رہا یہاں تک کہ عاصمہ بی کو حاکم صاحب کو جگانا پڑا۔ انہیں حقیقت کا علم ہوا تو ان کے منہ سے کف نکلنے لگا۔

"ٹھیک کیا عظمی نے' ٹھیک کیا۔ اس کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ شکل مت دکھانا۔" انہوں نے ملازمین سے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ ہاشم نصیر بڑی بڑی قسمیں کھاتا ہوا وہاں سے نکلا۔

وہ سوچنے پہ آیا تو سوچ گیا اور وہ جاتا بھنتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا مگر جو دشمنیاں مول لے لی جائیں' وہ جلدی فرو نہیں ہوتیں سو اس کا بھی سابقہ ہاشم نصیر کے آدمیوں سے پڑ گیا وہ کافی دیر تک تو لڑتا رہا مگر پھر اس کی ہمت جواب دے گئی عام سا انسان تھا' وہ ہیرو نہیں اس لیے بے دم ہو کر گر گیا۔ سنسان سڑک پر وہ بے یار و مددگار پڑا تھا جب کسی خدا ترس نے اسے ہاسپٹل کے گیٹ تک سہارا دیا اور گیٹ کے سامنے ڈال کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا کہ تھانہ پولیس کون بھگتتا پھرے ہاسپٹل کی انتظامیہ نے اسے فوری طبی امداد دینے کے لیے ایڈمٹ کر لیا پھر جیب سے حاکم صاحب کا کارڈ نکل آیا تو سارے مسئلے حل ہوتے چلے گئے۔ ذرا کی ذرا میں وہ سب ہاسپٹل میں تھے۔ عائنہ حاکم اس کے ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔

"کس قدر زخمی کر دیا آپ کو۔ پلیز عظمی بھائی! آپ' آپ اب ہمارے ہاں مت آئیے گا۔ آپ کو ہمارا گھر راس نہیں' ہمیں تو ساری زندگی یونہی رہنا ہے۔"

امینہ نے بھی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا پھر بولی۔

"عائنہ ٹھیک کہتی ہے عظمی بھائی! اب کے ٹھیک ہو جائیں آپ تو پھر لوٹ کے مت آئیے گا' کراچی بہت بڑا ہے کسی اور جگہ جاب کر لیجیے گا مگر ہمارے گھر نہیں' جب ہمارے بھائی کو ہماری پروا نہیں تو آپ کیوں دردِ سری مول لیں ہماری۔"

اس نے بے چینی سے اسے دیکھا پھر تھکے تھکے انداز میں بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کیا کوئی مرد ہی حفاظت کر سکتا ہے عورت کی' کیا انسان جو مجبور محض ہے وہ اپنے بل پر کسی کا محافظ بن سکتا ہے امینہ ؟؟"

امینہ حاکم کچھ نہ بولی تو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"یہ صرف ہمارے سطحی سے خیالات ہیں بے بی! کہ مرد' عورت کا محافظ ہو سکتا ہے کتنے گھروں کو میں نے دیکھا ہے کہ اس کے محافظ کے باوجود اس گھر کو لٹنے سے کوئی نہیں بچا پایا۔ یہ معاشرہ ہمارا معاشرہ سہی مگر یہ سب سیٹ اپ بھی تو ہم ہی بنانے والے ہیں کچھ ہم خود اور کچھ تم لوگ جو ہمیشہ اس خیال میں ہی پروان چڑھتے ہو' ایک بھائی بیماری اور پریشانی کا حل ہے۔ بھائی ایک مضبوط حوالہ سہی مگر حفاظت کرنا

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

حفاظت میں رکھنا تو سراسر خدا تعالیٰ کا شعبہ ہے ناں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو کب پریشانی سے نکالنے اور پریشانی سے بچالینے پر قادر ہے۔"

"کبھی بھی نہیں' یہ انسان کے بس میں نہیں۔"

"پھر تم لڑکیاں کیوں ہوتی ہو اس نعمت کے لیے' اگر نہیں ہے تب بھی صبر کرنا چاہیے۔"

"صبر! صبر ہم کرسکتے ہیں مگر ہمارے والدین' وہ جو ہمیشہ بیٹے کو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھتے ہیں۔ ہاں ان والدین کا کیا ہو جو ایسا سمجھتے ہیں' جو صرف بیٹے کو وارث گردانتے ہیں بیٹیوں کو رد کردیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ بیٹیاں تو دعا اور خوشی کا روپ ہوتی ہیں۔" اس نے بابا سائیں کو دیکھا۔

"آپ! صاحب کیا آپ اب تک اولادِ نرینہ کو ہی وارث سمجھتے ہیں؟؟"

بابا سائیں نے قہقہہ لگا کر یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی بچکانہ بات کہی ہو مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی تو بولے۔

"بھئی عظمی! میرا کیا صدیوں سے لوگوں کا یہی خیال ہے وارث اولادِ نرینہ ہی کہلاتی ہے۔"

"حالانکہ یہ ہی سب بڑا دھوکا ہے صاحب! میرے بابا کہا کرتے تھے۔ وارث' صرف نرینہ اولاد نہیں' آپ کے اچھے برے اعمال بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب تک آپ جیتے ہیں۔ آپ کا حوالہ رہتے ہیں اور آپ کے مرنے کے بعد آپ کے نام کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔ یہ تو ہم کوتاہ نظر ہیں جو انسان جیسی بے ثبات اور فانی چیز کو اپنی لافانی خوشیوں پر حاوی کرلیتے ہیں ہمارے نیک اعمال ہمارے لیے پھول بچھاتے ہیں صاحب اور بداعمال' برے وارث کی طرح جگہ جگہ ہمیں رسوا کرتے ہیں پھر کیا یہ درست ہے ہم اپنے رب کی حکمت اور فیصلے سے ٹکرائیں؟؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو' یہ درست نہیں مگر ہم میں سے کون ہے جو اس باریک نکتے کو سمجھے گا پھر ہم کیوں وقت برباد کریں بیٹا! اب۔"

بابا سائیں آگے بڑھ گئے تو وہ اپنی انیکسی میں اٹھ آیا پھر رونا نہیں چاہتا تھا مگر رونے لگا اچھی طرح دل کا غبار نکال چکا تو بستر پر آلیٹا کمرے کی بتی بند کردی تھی اس نے مگر یکدم ہی لائٹ آن ہوچکی تھی اور سلمان حیدر اس کے بیڈروم کی دہلیز پر جما کھڑا تھا اسے محویت سے دیکھتا ہوا اس نے استغراق دیکھا تو پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مانی؟" سلمان اندر چلا آیا پھر بالکل اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو بولا۔

"دیکھنے آیا تھا کوئی شخص کتنا سنگ دل ہوسکتا ہے۔ کیا تم واقعی اتنے پتھر دل ہو یا پوز کرتے ہو؟؟"

"کیا مطلب؟" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"مطلب یہی کہ اتنی ڈھیر ساری خوشیوں سے منہ موڑ کے تم آخر کسے سزا دینا چاہتے ہو؟" کچھ دیر رکا پھر بولا "میں سمجھتا تھا کہ میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اب تمہارا پیمانہ صبر چھلک پڑے گا۔ تم برملا چلا کر کہو گے ضمان حیدر میں ہوں مگر میں دیکھ رہا ہوں تم اس سچ کو کہنے کے بجائے اسے چھپانے پر کمربستہ ہو آخر کیوں؟؟"

"میرے شب و روز سے واقف ہو کر بھی پوچھتے ہو کیوں؟ کیا تمہیں نہیں پتا میں یہ سب کیوں کررہا ہوں۔ مانی! جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی مجھے اس سے بھی کڑی سزا ملنی چاہیے تھی میں نے خود پر ان خوشیوں کے در بند کرکے خود کو بہت زیادہ مارجن دے دیا ہے میں کسی بھی حوالے سے سہی ان سب کے درمیان تو رہوں گا۔ کوئی تو ہوگا' ان کا بھائی نہ سہی بھائی جیسا ہی سہی' کیا یہ کم ہے۔" وہ رکا پھر خود ہی تائید میں بولا۔

"نہیں یہ کم نہیں۔ یہ تو میری امید سے بڑھ کر ہے مانی! اور مجھے اس انجام سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ تم اس شخص کے جذبات جان ہی نہیں سکتے جو سب کچھ لٹا چکا ہو مگر بھولے بھٹکے سے اس کے پاس ایک سکہ پھر بھی بچ گیا ہو۔ ہتھیلی پر رکھ کر دیکھو تو وہ سکہ کھوٹا لگے گا مگر کسی تہی دست کے لیے کھوٹا سکہ بھی کتنا قیمتی ہوسکتا ہے یہ تم نہیں جان سکتے سوائے میرے یا کسی تہی داماں شخص کے جس نے واقعی سب کچھ گنوا دیا ہو۔"

سلمان حیدر پھر کچھ نہیں بولا مگر وہ اس طرح خاموشی سے بھی نہ بیٹھا ایک نئی کہانی گھڑ کر اسے

واپس اپنے حصار میں کھینچ لیا' پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا مگر جب عائنہ حاکم نے کہا۔

"ہمیں پتا ہے آپ کتنے بڑے اداکار ہیں ضمان بھیا۔" تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔

"کیا؟ بس یہ خوشیاں چھننے والی ہیں لیکن یہ سزا تو بڑی کڑی ہے۔" اور امینہ اس کے کاندھے سے جھول کر بولی۔

"ہمیں مانی بھیا نے سب بتادیا ہے عظمی بھائی! اوہ' میرا مطلب ہے ضمان بھائی! آپ نے ہمیں کتنے دنوں بے وقوف بنایا ناں۔"

"کیا پتا چل گیا آخر؟" دل و دماغ میں دھڑکنے لگا تو اس نے خشک زبان تالو پر پھیری پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

"کیا پتا چل گیا امینہ؟؟"

اور ہمو مزے سے بتائے گئی۔ "یہی کہ آپ ہی ہمارے بھائی ہیں۔ آپ یہاں گارڈ بن کر اس لیے آئے تاکہ یہاں کے حالات اور لوگوں کے مزاج آشنا ہوسکیں کہ بابا سائیں آپ کو قبول کرسکتے ہیں یا نہیں لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر سینہ سپر ہوگئے۔ حقیقی گارڈ بن کر ہماری حفاظت کرنے لگے اور یہ ہم ہی جانتے ہیں آپ نے ہمارے لیے کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔"

اس نے طویل سانس لے کر سر جھکالیا اور بابا سائیں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ دھر کر کہا۔

"ضمان! آج مجھے دوہری خوشی ملی ہے۔ مجھے دو بیٹے مل گئے ہیں۔ سلمان کو میں نے عائنہ کے لیے منتخب کرلیا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں۔ نہیں تو بابا سائیں۔" اس نے بے ساختہ بابا کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ وہ اب تہی داماں نہیں رہا تھا۔ پورے اعتماد سے مسکرا سکتا تھا اور عائنہ حاکم کے لیے دعا کرسکتا تھا کہ اس کا ہم سفر اعتبار اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو اور یہ سوغات بخشنے میں سخی ہو۔

* * *

خوبصورت اور معیاری ناول

حنا	نادرہ خاتون
شعاع	نادرہ خاتون
کنول	نادرہ خاتون
لبنیٰ	نادرہ خاتون
شگوفہ	نادرہ خاتون
چلمن	نادرہ خاتون
عرفانہ	نادرہ خاتون
دردانہ	نادرہ خاتون
اِک لڑکی پاگل پاگل سی	رضیہ جمیل
میرے ندیم	رضیہ جمیل
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل
آنگن کا چاند	رضیہ جمیل
دل ایک گلشن	رضیہ جمیل
بے نام سی خلش	رضیہ جمیل
ساگر دریا، بادل بوند	رضیہ جمیل
شاہکار	رفعت سراج
شہر یاراں	رفعت سراج
دل دریا تن صحرا	رفعت سراج
تو شریک سفر رہا	نسیم سحر قریشی
برگ گل	ایم سلطانہ فخر
دِل اک گلاب سا	ایم سلطانہ فخر
بھنور	شوکت رانا
گرفتارِ وفا	پروین شریف
شہرِ وفا	عینی ارسلان
گئے موسم کے گلاب	ذکیہ بلگرامی
بندھن	ذکیہ بلگرامی

خواتین ڈائجسٹ
اردو بازار، کراچی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

سعدیہ عزیز آفریدی

سن جوگی کا

اُس کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی اور کمرے میں ہلکی آواز میں چلتا ٹی وی اس بات کی علامت تھا کہ شاہ میر جاگ گئے ہیں۔

دائم نے میوزک پر سر دھنتے ہوئے ہلکی سی انگڑائی کے بعد پورے بدن کو تاؤ دے کر طویل انگڑائی لی اور اپنی طرف کمر کیے کرسی پر بیٹھے ٹی وی سے محظوظ ہوتے شاہ میر کو دیکھا۔ (80) کی دہائی کا میوزک چل رہا تھا اور میوزک سنتے وقت وہ مداخلت پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ سستی والی کیفیت میں اٹھا اور واش روم کی طرف بڑھا۔ واش روم میں داخل ہوا تو اس تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"شاہ میر! آپ نے آج پھر میرے استری کیے ہوئے کپڑے پہن لیے؟"

دائم جتنی تیزی سے باہر آیا تھا شاہ میر کو ٹی وی کے سامنے ہی ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس کی چیخ سن کر ہی منظر سے غائب تھے لیکن آج دائم کا ارادہ تھا کہ وہ شاہ میر سے دو بدو جھگڑا کرے یہی وجہ تھی کہ وہ اسی حلیے میں سیڑھیاں اترا تھا مگر کھانے کے کمرے میں سب کو بیٹھا دیکھ کر اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ شرٹ کے بغیر بنیان اور ٹراؤزر میں کھڑا وہ خود بھی اپنا

ناولٹ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSO

اور دادو کی لمبی نصیحت بھری تقریر شروع ہوتی، وہ دانت پیستا ہوا واپس اپنے کمرے میں آیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"آپ انسان ہیں یا بھوت؟ ابھی آپ یہاں نہیں تھے۔" وہ واقعی حق بجانب تھا حیرت دکھانے میں مگر شاہ میر کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اب ان کی الماری کھولے کھڑے تھے۔

"یہ پرفیوم ڈھائی سو ڈالر سے کم میں آگیا؟" ان کے چہرے کی معصومیت دانم کا غصہ کم نہ کر سکی۔

"یہ ممی نے دیا ہے، گفٹ ہے اور پورے ڈھائی ہزار کا ہے۔"

"آہاں، مکاتیر صاحب نے دیا ہے، لیکن یار صرف ایک ذرا سی تو مانگا تھا، پلیز اس غلطی کی اتنی سزا تو مت دے یار۔" شاہ میر کھسیانے لہجے میں بولے اور دانم کو ہنسی آ گئی۔

"بس کریں، اتنی اداکاری نہ کیا کریں۔" اب وہ [illegible] ان کی شرٹ پر اپنی [illegible] کے نیچے ہوئے پلٹتے شاہ میر کو [illegible] رہا تھا۔

"لیکن یہ آپ کی بہت اچھی ہے، بس تھوڑی سی مار کھائی ہے بھابھی کی جوتوں سے۔"

"شاہ میر! یہ فضول باتیں نہ کریں، آپ کی کزن کی بیٹی ہے۔"

"تب ہی تو کہہ رہا ہوں، آپ نے [illegible] ہو کر ماؤں اور نانیوں کے اچھے انتخاب کی دنیا میں کمی نہیں۔" وہ لوگ مجبوراً بولے۔

"وہ بلیک کف لنکس کہاں رکھے ہیں؟ رات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔"

"شاہ میر! آپ میرے ہاتھ سے قتل ہو جائیں گے، آپ کو پتا نہیں ہے؟"

"ہاں ہے، میرے پاس کیا ہے، تمہیں کیا پتا ہے؟" وہ اداکاری کرنے پر اتر آئے اور دانم نے ان کی ٹون ہی میں کہا۔

"شکر ہے، آپ سے بہت اچھی ماں ہے میرے پاس۔" اور شاہ میر نے آنکھیں نکالیں۔

"قرب قیامت ہے، آج ماں کے چکر میں اپنی دادو کو کم تر کہہ رہا ہے؟ مقتول! اگر آج دادو ہوتیں تو کیا اتنا اچھا باپ ملتا تجھے؟"

"شاہ میر! آپ بات کو غلط رنگ میں لے رہے ہیں۔" لیکن وہ اس جملے سے بچتے نہیں اور دانم کو الماری میں سے کف لنکس نکال کر ان کے سامنے رکھنے پڑے کیونکہ وہ ڈھٹائی ہی لیے رہے تھے۔

"بہت خبیث ہیں آپ!" اتنے ہی وہ انہیں توپ قسم کی اپنی زبان میں خبیث ہی کہتی تھی، ہمیشہ کی طرح لیکن آج بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ کمرے سے باہر نکلے تھے جب دانم نے یکدم شاہ میر کو روک کے پوچھا۔

"آپ کو قسم ہے، سچ بتا کر جائیں، جب میں بہت شدید غصے میں ہوتی ہوں تو آپ ایک دم کمرے سے کہاں گم ہو جاتے ہیں؟" وہ آگے بڑھ کر بڑے پیار سے ہاتھ پکڑ کر بولے "تمہارے غصے سے بچنے کے لیے میں شاہ زین بھائی کی گود میں بیٹھا ہوتا ہوں۔"

"آپ کا دماغ خراب ہے! اگر زین خراب ہو جاتے تو آپ کو پتا ہے آپ کہاں ہوں گے؟" وہ سوچ کر [illegible] شاہ زین بھائی کے غصے سے اس [illegible] کی چاروں طرف [illegible] تھا اور میں میں حتمی [illegible] کے لیے پیر رکھنے کے لیے جگہ بنانا پڑتا تھا۔ [illegible] غصہ آتا تو [illegible] اور [illegible] کے لیے بازو [illegible] بھی سب [illegible] سے معافی مانگتے تھے۔

"اگر آپ کو کبھی دیکھ لیں تو؟"

"تو مجھے بتائے آخر میں کس کونے میں چھپنے [illegible] اترنے کی۔ شاہ زین بھائی سے [illegible] آخر میں [illegible] آنسو پونچھ لو۔ شاہ جنید کے گھرانے کے مرد بھی روتے ہیں۔ ساری بھابیاں سکون کا سانس لیں گی اور شاہ احمد بھیا؟ وہ تو شکم سے روزے میں۔ [illegible] حیرت اور حسرت ہو جائے گی سب اس بندے کے اندر کوئی آثار نہ [illegible]

پیدا ہوئیں جس دن مراتب یہ بندہ تقی دنی اسکالر کی طرح بس وقت کی خاموشی اختیار کرے گا اور اپنے کسی غم میں بزی ہو جائے گا۔"

"توبہ ہے شاہ! اگر آپ کے خیالات ان تک پہنچ گئے نا، کسی دن تو خوب اپنی بہت کی ذلت پڑ جائے گی۔"

"پڑ جائے، میں کوئی ڈرتا ہوں۔ اللہ جانتا ہے، اللہ کے بعد صرف اپنی ماں سے ڈرتا ہوں۔"

وہ صاف گوئی سے بولے اور پیچھے چلے گئے تھے۔

تب دائم نے گہری سانس لے کر باتھ روم کا رخ کیا۔ نہا دھو کر تیار ہوا۔ والٹ اٹھاتے ہوئے اس نے رقم گنی اور پانچ سو روپے غیر ہو گئے۔

"یہ شاہ میر بھی ۔۔۔" وہ جلا بھنا ہوا واپس کمرے میں آیا اور حیران رہ گیا، وہ کینڈل کیک لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے دائم ۔۔۔!" اسے حیرت ہوئی کیونکہ اسے اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی۔

"آپ کو کیسے یاد رہ گئی، میں تو بھول گیا تھا؟"

"وہ بے چاری کہاں بھولی تھی، تین بجے سے فون کیے جا رہی ہے۔ مگر میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا اس لیے تمہارا سیل فون آف کر دیا۔ تو وہ بے چاری کب سے کوشش کر رہی ہو گی۔" وہ مزے سے کہہ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"یہ آپ جیسا ہوم سک بندہ کب سے کیئرنگ ہو گیا؟"

"بس کبھی کبھی دل چاہتا ہے دائم! ہم جس سے محبت کرتے ہیں، وہ صرف ایک لمحہ پاس ہو، ہمارے ساتھ ہو۔ یہی زندگی کا سب سے حسین رشتہ ہے جو ہم محبت سے گزارتے ہیں۔"

"آپ اتنا متاثر کیوں ہو رہے ہیں، خیریت؟" اس نے شاہ میر کو حیرت سے دیکھا، وہ مسکرا کر بولے۔

"ہاں! میں جانتا ہوں تم شروع سے مجھے اپنے سے لگتے ہو۔ جب میں گھر آیا تو پوری زندگی میں تم میرے پہلے دوست تھے۔ مجھ سے چار سال چھوٹے مگر میرے بہت اپنے۔ بڑے بھیا کی خاموش محبت، شیطانی، لاپروا کرنا، یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا پھر نہ جانے بھابھی کو کیا ہوا، انہوں نے تمہارے بگڑ جانے کے ڈر سے تمہیں ہاسٹل میں شفٹ کروا دیا اور تم جانتے ہو، یہ اتنے سارے سال میرے لیے کتنے تکلیف دہ اور اکیلے تھے۔"

اور یہ سچ تھا۔ وہ پچھلے سال ہی سی ایس ایس مکمل کر کے گھر آیا تھا پھر سول سروس کی ٹریننگ وغیرہ سے نمٹ کر تقریباً تین ماہ سے پوری طرح شاہ میر کے زیر کنٹرول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ میر اس کے ساتھ کو انجوائے کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ شاہ میر کو سوچ کے زاویوں سے جانچ رہا تھا، جب انہوں نے چاکلیٹ کیک کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں رکھا اور خود بھی کھانے لگے۔ دائم نے اچانک پوچھا۔

"لیک مزے کا ہے مگر آپ اتنا تیار کیوں ہوئے ہیں شاہ میر؟"

"تمہاری برتھ ڈے کے لیے۔" جواب پر وشنے والا ہی تھا کہ ماما کھانے کے کمرے میں آگئیں اور شاہ میر کو تیز نظروں سے گھور کر بولیں۔

"تمہارے پاس اپنی بھی کوئی چیز ہے؟ سر سے پیر تک ایم سے مانگی ہوئی چیزوں سے سجے ہوئے ہو۔"

"ماما...!" اس سے پہلے کہ ایم انھیں منع کرتا شاہ میر ان کے قریب بڑھتے چلے گئے پھر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولے۔

"یہ تو میرا اپنا ہی ہے... یہ مسکراہٹ... یہ خالص میری ہے۔" وہ بولے سے مسکرائے بھی تھے اور ماما ان کی مسکراہٹ پر ٹھٹک گئیں۔

"میں سب سے کہتی ہوں کہ شاہ میر اب گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا [illegible] تمہیں اماں اور بابا کو کیا نظر آتا ہے تم میں اور باقی سب بھی تم سے کمپرومائز کیوں کر کے رکھتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ انھیں آتا ہے میں مستقبل میں کوئی بہت بڑا [illegible] بننے والا ہوں [illegible] میرا [illegible] کہ میں کہیں [illegible] جب میں مشہور ہو جاؤں تو آپ بچوں کو بھی نہیں [illegible]۔"

وہ کچھ کہنے والی تھیں کہ ایک بات [illegible] سخت کر دی تھی ایم [illegible] پر بیٹھا تھا کہ وہ اس کے پاس چلے آئے۔

"چلو ایم! باہر کتنے مزے کا موسم ہو رہا ہے۔"

"کوئی نہیں ہو رہا مزے کا موسم [illegible]۔" اس نے گھور کے کہا اور شاہ میر ہنس دیے۔

"تم کیا جانو [illegible] جب جس روز [illegible] پنجاب میں بارش ضرور ہوتی ہے۔" [illegible]

"ہاں پنجاب میں [illegible] کراچی میں نہیں۔ آپ کراچی کی شام میں بیٹھے ہوئے ہیں میری جان۔" اس نے شرٹ کے اوپری بٹن کھولے ہوئے تھے جب کہ وہ

جینز پر کرتا پہن کر بڑے ٹپ ٹاپ سے تیار کھڑے تھے۔

"کہاں جا رہے ہیں شاہ میر...؟" اس نے انھیں تیار دیکھ کر پوچھا۔

"بس تمہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں بادل اوب گیا ہے گھر سے۔ چلو، تمہارا [illegible] نہیں؟"

"نہیں میں نہیں جا رہا تھک اس گرمی میں صرف گھر میں رہنا پسند ہے۔"

اس نے صاف منع کر دیا اور وہ [illegible] کر بیٹھ گئے۔ ایم کا خیال تھا وہ اب خود ہی چلے جائیں گے مگر دوسرے ہی لمحے شاہ میر نے ایم کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

"مجھے کیا لگتا ہے میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا؟"

"مجھے کہیں نہیں جانا شاہ [illegible]" وہ تنگ کر بولا مگر وہ خاطر میں لائے بغیر اسے ساتھ لے گئے۔

"بالکل اس نے [illegible] لوگوں کی طرح [illegible] بن کر مر جاتے کیا انسان بن [illegible] اچھا سا انسان۔ چلو وہاں [illegible] چاند کی باتیں کرنے والا [illegible] باتیں کرنے والا [illegible] ان کے آنسو صاف کرنے والا کسی کے دکھ بانٹنے والا سا انسان۔"

"مجھے ان میں سے کوئی نہیں بننا شاہ! مجھے ایلیٹ کلاس میں جینے کے ڈھنگ سکھائے گئے ہیں اور آپ ساتھ سڑک کی ادنیٰ سی باتیں کر رہے ہیں۔"

"ایم! کیا تم بھی جب [illegible] سے [illegible] تب" شاہ میر سنجیدگی سے بولے۔

"آپ جیسے لوگوں کے لیے خلیل جبران کہتا ہے باتونی لوگوں پر صرف گونگے ہی رشک کر سکتے ہیں۔"

وہ ایم کے اس جملے پر شاہ میر [illegible] گاڑی میں [illegible] کر گیا تھا "اوئے ہوئے [illegible] انداز ہے بدتمیز شرم کرو میں تمہارا چچا ہوں۔"

اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔ بے شک چند [illegible] میں تھے مگر خوب صورت تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں دراز قد وہ اسے متاثر کر جاتے تھے۔ لڑکیوں کا

UrduPhoto

حال ہی عجیب تھا۔

"مجھے لگتا ہے میں آج بہت خوب صورت لگ رہا ہوں، بلیک رنگ مجھ پر واقعی بہت سوٹ کرتا ہے۔" اس نے بریک پر پاؤں کے دباؤ کے ساتھ دیکھے۔ بکھرے بکھرے پاؤں اور ان پر ڈارک براؤن کولہاپوری۔

"تو میں چھپا کر رکھا گیا ہے کیا؟" شاہ میر مسکرا کر بولے۔ وہ جھینپ گیا۔ اتنے غور سے تو اس نے کبھی اپنی منگیتر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

"تجھے تیری صحبت خراب کر گئی ہے۔" وہ شرارت سے بولے۔

اب کی بار وہ ہنس پڑا تھا۔ "توبہ شاہ میر ماما کی بات کہاں لے گئے ہیں۔ میڈیکل آپ جیسے لوگوں نے تو رشتوں کا بھرم ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب جو ان دوست بھی بیٹھے ہوں تو لوگ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں۔"

"ہمم یہ تو ہے، پر تم کیا لوگ تو سوچیں گے ہی۔ کیا ہے تا کہ ہم جوان ہیں تم بھی۔" شاہ میر کا اس ریٹائرمنٹ کی تفصیل اب وہی فراغت ہم والے تھے واپس۔

"مجھے کیا کرنا ہے آگے؟ جب کے لیے؟" اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔

"بس دو ہزار چاہئیں یار جلدی۔"

"دو ہزار؟ ابھی تو آیا ہوں، ابھی پیارے لاکھ لاکھ دس ہزار سینے کے آپ کو۔"

"یار میرے ہاتھ میں تمہارے پیسے رکتے ہی نہیں جیب بھی روک کر۔"

"بس یہ ان کی عادتیں ہیں، دو گھر کی عورتیں آپ سے ناراض ہیں۔ آپ کی وجہ سے ان کا بجٹ خراب ہو جاتا ہے۔"

"عورتیں تو کو سب سے ہیں، ان کا ناکس چاہے وہ ایکسپرٹ ہو گنہگار کو جنت کا تیر دینا۔"

"ویسے کل دادا بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

ان کی مسکراہٹ میں شرارت در آئی تھی۔ "وہ تو جنتی عورت ہیں بلکہ جنت ہیں میرے لیے۔ ان کے لیے مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ ان کی کسی بات سے مجھے اختلاف نہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "ماما جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ ابھی آپ کے لیے کوئی سخت کمنٹ پاس کر ہی نہیں سکتیں۔"

"ہاہا۔ ظاہر ہے ان کا لاڈلا بیٹا ہوں۔ آج پیار آتا ہے، اشارہ کر بس۔" وہ مصنوعی کالر اکڑانے لگے۔ ماہم نے والٹ نکال لیا تھا مگر اس میں دو ہزار تھے جو اس میں نہیں تھے۔

"چاچو! آپ جیب کترے کب سے ہو گئے؟"

"ارے جناب! ایسی کیوں بنے لگے جیب کترا۔ کسی اپنے کی جیب سے پیسے نکالنا کہ وہ خود بھی دینے پر آمادہ ہو، جیب کترا پن تھوڑا ہوا۔ یہ تو عقل مندی ہے۔"

"پوچھ سکتا ہوں یہ عقل مندی آپ نے کہاں کی ہے؟" اس نے لفظ چبا کر کے پوچھا۔ وہ مسکرائے۔

"ایک دوست کو بہت پہلے نے پکڑا تھا بازار میں اچانک۔ ایک میری جیب تراشتے ہوئے کوٹ کے اندر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شرمندگی سے رونے لگا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا اس کے ماتھے پر ہوا سا ان کی ایک شن چیپ کر گئے ہیں اس لیے تنخواہ سے قرض تنگ رہا تھا۔ میں نے والٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور لے آپ خود لے لو۔ بس کرا کے چھوڑ دیا۔"

"کیا ایسا ہی ان کی ہر رات رہتے ہیں لیکن آپ کے سب دوستوں کو تو سب دل آف گیلریز سے ہیں۔ اور یہ کس زمانے کا واقعہ ہے کہ آپ کہانے کی بات کرتے ہیں، پندرہ منٹ سے آپ گھر کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتے آ رہے ہیں چاچو۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ "ابے اس کا مطلب ہے میں بھی ایک اچھا واقعہ نگار نہیں ہوں، تمہاری جیسی عقل مندی کے سامنے جھوٹ بولا تو فوراً پکڑا جاؤں گا۔"

"تو جب جھوٹ بولا! آنا میں تو بولتے کیوں ہیں؟" اس نے گھورا۔

وہ ٹھٹے سے ہو کر بولے "کل بھابھی کو جھوٹ پر سچ چینٹ کرتے دیکھا تو مجھے لگا میں بھی اچھی خاصی گل کاری کر سکتا ہوں۔"

"کون سی بھابھی۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" دائم کے کان کھڑے ہوئے۔

شاہ میر شرارت سے بولے "ارے وہ تو جنتی عورت ہیں میں کہاں ان کے خلاف بول سکتا ہوں۔ میں تو صبا بھابھی کی بات کر رہا تھا۔ کل بھیا سے کہہ رہی تھیں شاہ میر بہت بگڑ گیا ہے۔ آج اس نے میری فرینڈز کے سامنے بڑا مذاق بنایا، کہا کہ آپ کے گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"ہوا کیا تھا۔۔۔؟" وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے اپنے سامنے سانپ دیکھ لیا ہو۔

صبا بھابھی گھر بھر میں بڑی مرچ مشہور تھیں۔ انہیں باتوں کو رنگ لگانا اس میں تڑکا لگانا، چٹخارے لے کر سنانا خوب آتا تھا۔ ہر کوئی ان سے خوف کھاتا تھا مگر شاہ میر تھے اس زمانے کے ایک عجیب ترین انسان جنہیں خطروں سے کھیلنا اور جیت جانے کا شوق تھا۔

"اب بولیں بھی! آپ نے کل کیا ڈرامہ کیا تھا بھابھی کی مشہوری کے لیے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ان کی کچھ فرینڈز آئی تھیں سب مجھے دیکھ کر شاید کچھ حیران رہ گئیں یہ تو بڑے سے ہیں، چار پانچ سال ہی بڑا لگتا ہے۔ بھابھی اپنی کزنس میں بدنام ہیں اور میں انہیں جاننے کو دوڑ لگا کر گھر میں تھا، ویسے بھی کی نام ہی بتا رہی تھیں۔ بھابھی انہیں صرف کولڈ ڈرنک پلا کر ٹرخانے والی تھیں اور میں کیسے چپ رہتا سب کے سامنے کہہ بیٹھا بھابھی میں منہ میں بنا کے بولا، کیوں بھابھی آج پھر سے کباب کھانے کا سوال ان کے مینو میں؟ میں نے اپنے کباب بھی ایڈ کروا دیے۔ لیکن پھر بھابھی نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں فرشتہ نہ ہوتا تو بھسم ہو کر مر جاتا۔"

"شاہ میر! آپ بھی ناں۔۔۔" وہ ان کے فرشتے والی بات پر ہنسنے لگا۔

وہ مزید شرارتی ہو کر بولے "بھابھی نے بھیا کے لیے کباب بنا کر رکھے تھے کل، ان کی آمد پر تھا۔ ان کا خیال تھا وہ رات کو کباب کی منہ دکھائی اکیلے میں کروائیں گی مگر میری وجہ سے انہیں فوراً ختم کرنا پڑی، پھر کھانا کھاتے کھاتے جب میں نے اپنی برتھ ڈے کا شوشا چھوڑا تو صبا بھابھی کی شکل دیکھنے والی ہو گئی تھی وہ مجھے منع بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ میں اور کھل گیا، پھر ان کی ساری فرینڈز ایک دوسرے پارٹی لینے کے چکر میں آگئے، بھیا جی بڑا کرا اچھی خاصی رقم میری جیب میں ڈالنے لگے، بھابھی دانت پیس رہی تھیں جب میں نے معصومیت سے ان کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا تھا۔

"کیوں بھابھی ماں! آپ مجھے کوئی گفٹ نہیں دیں گی؟"

بس پھر ان کی سرخ آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ کیا غضب تھا ان میں، مگر صبا بھابھی نے پورے دو ہزار میری ہتھیلی پر رکھے تھے "کل ملا کے میں نے جیسے بچا کے پندرہ ہزار کما لیے تھے۔"

"پندرہ ہزار۔۔۔ آگے کہاں چلے؟" دائم پھر حیران ہوا اور وہ [illegible] بولے۔

"پانچ ہزار الٹر کی جیب میں ڈال دیے تھے تاکہ جب بھابھی میری شکایتیں لگا رہی ہوں بھیا سے تو الٹر میرا وکیل بن کر میری طرف داری کرے۔"

"پھر کیا اس نے طرف داری کی؟" دائم نے انہیں گھورا، وہ شرارت سے بولے۔

"ہاں ہاں کیا طرف داری کی، وہ بھی بڑی زبردست، ویسے بھی بھیا تو بھیا۔ بھابھی بھی اس کی بات کو اگنور نہیں کر سکتیں۔"

"اس نے کیا کہا آپ کی بابت؟" دائم کو کھد بد ہونے لگی اور وہ اسی شرارت بھری ٹون میں بولے۔

"اس نے کہا پاپا! چاچو نے یہ سب ڈرامہ کوئی اپنے لیے تھوڑا کیا تھا، وہ تو چیری کے لیے رقم جمع کرنا چاہتے تھے۔"

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

آپ جانتے ہیں ماما سمیت ماما کی کئی ویری فرینڈز چیریٹی پر وہ اسی وقت خرچ کرتی ہیں جب انہیں وہاں میڈیا کی لائم لائٹ میں جگمگایا جائے اور چاچو تو تیلی بھی ہے صرف چیریٹی کرنے کا شوق رکھتے ہیں کس لیے انہیں یہ ڈرامہ کرنا پڑا۔"

"ہمم۔" داؤ مسکرائے اور دلچسپی سے وہ مزید بولے۔

"پھر بھابھی نے کہا اور وہ کباب کھا گیا سارے۔"

بھیا نے غور سے انہیں دیکھا۔ "بس کرو صبا اتنی تنگ دلی کا ثبوت نہ دیا کرو جیسے ہمارے لیے ظفر اور شہباز ہیں ویسے ہی شاہ میر۔" صبا بھابھی پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں اور میں نے بھیا کے بیڈ کے نیچے انگڑائی لے کر سوچا بیڈ کے اوپر اور بیڈ کے نیچے سونے والا ایک جیسے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ زمین پر چیونٹیاں اور لال بیگ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"شاہ میر! توبہ کریں۔ چاچی کو صفائی کا بہت خبط ہے ان کے کمرے میں چیونٹیاں اور لال بیگ نہیں ہو سکتے۔"

"پتا ہے مجھے میں تو دیوان کے قول کو ٹھیک کر رہا تھا۔"

"واہ واہ آپ اور دیوان کے اقوال کو ٹھیک کریں گے۔ جانتے بھی ہیں وہ کتنا بڑا فلسفی تھا۔"

"بہت پتا نہیں تھا۔ کیا بیڈ پر سونے والے کو چیونٹی کا ہو گا اور تمہارے چاچو جیسے فرنٹ 3 ڈاکٹر ہیں جن سے ثابت ہوا وہ فلسفی بیچارہ تو محروم رہے انسان۔"

"کیا پتا ہے آپ نے ہوائی تاپنے کا۔" وہ ہنسا اور پھر رازدارانہ بولا "ویسے تیزی کی بات ہے آپ نے دو پیسے کس چیز کی الٹ میں خرچ کرائے۔"

"سیمی کی اچھی بات ہے سب سے زیادہ چیریٹی کا تو میں خوشی [illegible] ہے۔ تم [illegible] خوشی خرید لو تو کوئی [illegible] ہو!"

"جی ہاں لیکن غلط بات ہے آپ بھی کیسی باتیں کر سکتے ہیں۔" وہ کار آگے کر کے ایک ٹھیک طرح تعریف پر مسکرائے۔ ان کی گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی تھی۔

"یہ اسٹیو ہوٹل بہت مہنگا ہوٹل ہے۔" شاہ میر نے عینک اتار کر داؤ کو غور سے دیکھا پھر رازدارانہ بولے۔

"خیر ہے! یہ تیری روح اندر سے اتنی غریب کب سے ہو گئی۔"

"شاہ میر! یہاں چائے کا ایک کپ ڈھائی سو کا ہے۔"

"اچھا بیٹا! تو صرف چائے پینے کو ڈھائی سو روپے تو ہوں گے نا تیرے پاس؟ میں تو یہاں کے چکن چیز سینڈوچ کھانے آیا ہوں۔ ساتھ کارنگ ساس والے فنگر چپس۔ Yummy۔"

"یہ آپ ایک دم سے رئیسوں والے چونچلے کب سے کرنے لگے؟"

وہ مڑ کر شرارت سے بولے "جب سے مجھے پتا چلا ہے میرا بھتیجا اران فسٹری میں جانے والا ہے۔"

اس نے اتنی اپ سیٹ ہو کر شاہ میر کو حیرت سے دیکھا پھر بولا۔ "میں نے انٹری ٹیسٹ ضرور دیا ہے مگر تین ہزار میں سے میرا سلیکشن ہو جائے یہ ضروری تو نہیں شاہ میر۔"

"نہ نہ۔ یہ وہ وقت [illegible] بتاتا ہے اس [illegible] کی [illegible] دھوم ہے [illegible] میدانوں میں۔"

وہ اب اندر داخل ہو چکے تھے اور داؤ کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے حیران تھا کہ [illegible] کی یہ دھیان کہاں سے [illegible]۔

"دراصل ایک دوست ہے جنل راؤ بہت مشہور عالم ہے [illegible] اور [illegible] لو کوئی کام نکلوانا ہو جائے تو بس جنل راؤ کے گلے پیر پڑ جاتا ہوں۔"

"تو یہ شاہ میر صاحب دوستوں کے ساتھ یہ سلوک۔ آپ کو کبھی شرم بھی آتی ہے۔"

"ہاں آتی تھی ایک بار جب میں نے بابا کے سامنے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا اور بابا جان بولے تھے، بہت ہو گیا شاہ میر اور کتنا جھوٹ بولو گے۔"

"یہ کس زمانے کی بات ہے؟" دائم نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی اور وہ اسی مسکری شان سے بولے۔

"یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے ویسے آپس کی بات ہے بیٹا میں بابا جان ہمیشہ میری طرف سے اتنے مشکوک کیوں رہتے ہیں حالانکہ دس بجے تک گھر آجانے والی پہلی اور آخری اولاد ہوں ان کی۔"

بات بھی ٹھیک تھی۔ دائم اب ہنسی ضبط نہیں کرسکا تھا۔

"ایک ایسی اولاد جو کوئی کام نہ کرتی ہو ان کا رات کے دس بجے آنا بھی مشکوک کردیتا ہے۔ سارا دن کیا کرتے رہتے' یہ سوچ کر چاہوں گا تو خیال ہے' آپ نے چھپ کر کوئی شادی تو نہیں کر رکھی۔"

"اب میں چھپ کر شادی کیوں کروں گا۔ مالی طور پر اخلاقی طور پر ہر طرح سے مضبوط ہوں یار! بابا گرل فرینڈ بہت مارتی ہیں۔"

"کیا مضبوط کردار ہے۔" دائم نے پھر سے طنز کیا۔

دیا شاہ میر بولے۔

"کام کتنے رہتے ہیں بہت سے۔ سارا دن اچھا کیا کرتی ہیں [illegible] میری۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئے۔ انہوں نے ٹیبل پر رکھے نمبر پر نظر ڈالی تو کاؤنٹر سے ایک ویٹر دوڑا آیا تھا۔ دائم نے دیکھا [illegible] ان کی ٹیبل کا سروس بل ایک بہت [illegible] گیا تھا۔

"جی سر فرمائیے۔" ویٹر ان سے آرڈر لے رہا تھا انہوں نے شام کی چائے کا خاص اہتمام کروا لیا تھا۔ دائم نے احتیاطاً کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر ٹیبل کے نیچے دیکھ کر پھر سے نوٹ گنے پورے پندرہ ہزار تھے [illegible] بس نکال دیا تھا۔

پندرہ منٹ کا وقت وہ گزر چکا تھا اور اب شاہ میر دائم کو ڈھونڈ رہے تھے۔

"بس یہ نوٹ اور یہ کام فوری کیا ہے تم پہلے بھی کر چکے تھے پھر ضرورت کیوں محسوس کی؟"

"اس لیے کہ میرے ساتھ ایک بہت ہی فن کار آدمی بیٹھا ہے میں نے سوچا کیا پتہ۔"

اب شاہ میر زور سے قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھیں تک بھیگ گئی تھیں۔

"آپ ہنستے رہا کریں شاہ میر۔" وہ بے ساختہ بولا اور شاہ میر شرمانے کی اداکاری کرنے لگے۔

"بائیں نظر نہ لگا دینا بچے کو۔ ویسے ہی میری بی کا خیال ہے میرا خون بڑا بانکا ہے۔"

"بس کریں کوئی نہیں خوب صورت آپ جو آپ کو نظر لگتی ہے۔"

انہوں نے گھور کے دیکھا اور اسٹائل سے بولے "نظر نظر کی بات ہے۔ ماں کی نظر سے دیکھو بیٹا کا سب سے خوب صورت انسان ملوں گا۔"

"بس کریں خوب صورتی کی اس ٹرم کو اس کے لیے داد و تحسین بہت ہیں پتہ نہیں کیا نظر آتا ہے انہیں آپ میں۔"

وہ دولے سے مسکرائے پھر آہستگی سے بولے۔

"میں ابھی آیا۔" اور اٹھ کر ایک دم غائب ہوگئے۔

[illegible] انتظار کیا پھر آہستگی سے اٹھا۔ ان کا والٹ اور موبائل ٹیبل پر ہی تھا یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ دور نہیں گئے۔

دائم نے شاہ میر کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی تھی پھر وہ نظر آگئے۔ وہ ایک بیرے سے باتیں کر رہے تھے اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے' ہوتے ہوئے اس کے ہاتھ کی ادائی [illegible] اور [illegible] سے سہلا رہے تھے۔

وہ اوٹ میں ہوگیا جبھی وہاں سے ایک ویٹر گزرا۔

"سنیے یہ ویٹر کون ہے؟"

"جی یہ ویٹر ہے۔" سامنے کھڑا شخص بھی ایک نمایاں تھا۔ دائم نے کہا۔

"اس کا نام اور یہ کیسا آدمی ہے؟"

اس نے دائم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر قدرے تنفی سے بولا "مشال خان ہے اور آپ جیسے حسن پرست افراد کو ڈیل سے اسمبل فراہم کرتا ہے۔"

"ڈیل۔" دائم کے منہ کا مزا خراب ہوگیا۔ یہ شاہ

میر کن چکروں میں پڑ گئے۔ یہ واقعی اب وہ اخلاقی قدروں کو ٹھوکر مار کر لذت کے راستے پر چل پڑے تھے مگر یہ تو گناہ کا راستہ تھا اور شاہ میر کو اس نے بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا۔

وائم تھکا ہوا آ کر بیٹھ گیا، پانچ منٹ بعد شاہ میر واپس لوٹے۔ ان کا چہرہ بجھا بجھا ہوا تھا۔

"گرمی بہت ہے، ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا ہے تو تھوڑا سکون ملا ہے۔"

"گرمی اور بڑھ گئی ہے۔" وائم کو یکدم وہ بہت تھکے لگے تھے۔ اے سی کی ٹھنڈک میں گرمی کی بات نہایت احمقانہ تھی مگر وہ کر رہے تھے۔ وائم نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

"آج رات آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"آج ایک دوست کی بیٹی کی مایوں ہے، وہاں جانا ہے۔"

"ایک اور جھوٹ۔" وائم نے غصے کا گھونٹ پیا۔ مگر اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس [illegible] کے پیچھے چھپے چہرے کو سب کے سامنے ظاہر کرے اور پھر اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال کر ان سے ہر تعلق توڑ لے۔

"کس بات [illegible] ہو؟ [illegible] تمہارا [illegible] رنگ جل جائے گا جو [illegible] دیکھا بھی نہیں۔" [illegible] کے پیچھے چھپے وائم کے ہونٹ مسکراہٹ کو چھو جاتے تھے مگر ان کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

"تمہیں [illegible] میں [illegible] پریشان کیوں ہے؟"

"مجھے آپ کے ماتھے پہ [illegible] نہیں پڑتا۔" وہ ایک دم اکھڑ گیا تھا۔

شاہ میر نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "آج [illegible] ذرا [illegible] لے چلنے [illegible] ان کے چھوٹے [illegible] کی طرح [illegible] چلا آیا تھا۔ "کیا شاہ میر کو کوئی ہوا ہے آپ؟" وائم نے سوچا وہ اس کے لیے چائے بنانے لگے۔ "آج چائے میں ایک چمچ زیادہ ڈال رہا ہوں گے۔ تیرے من کی کڑواہٹ کم ہو جائے۔"

وہ کچھ نہیں بولا، خاموشی سے سینڈوچ کھانے لگا۔

"اماں کہتی ہیں جس کا من سچا ہو، اس کی مرادیں بڑی پوری ہوتی ہیں۔" وہ ترنگ میں بولے اور وائم کو [illegible] پڑنے لگے [illegible] اس کی شرمیں اور شاہ میر کی محبت

"میرا دل چاہتا ہے آج تیز بارش ہو، تیرے ساتھ بارش میں بھیگے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں۔"

"میرے ساتھ بارش میں بھیگنے کا بڑا شوق ہے آپ کو؟" اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لیا۔ وہ مسکرائے تھے۔

"تجھے یاد ہے جب تو گاؤں سے چھٹی پر آیا کرتا تھا تو میں گرمیوں میں تیز دھوپ میں تیرے لیے بارش کی دعا مانگا کرتا تھا۔ تجھے بارش بھی اپنی گرل فرینڈ لگتی تھی اس زمانے میں تو شبانہ باجی اور آصفہ باجی کی طرح وہ میری سہیلی ہوتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا میں ساری کی ساری رات بارش میں نہاتا رہوں۔ پتا نہیں کیوں تجھے [illegible] لگتا ہے۔"

"مگر کیا آپ کی دعاؤں پہ بارش ہو جاتی تھی؟" وہ اب بھی اکھڑا تھا۔

"ہاں تو جب تیرے لیے دعا مانگتا ہوں کبھی کبھی قبول ہو جاتی تھی اگر تم [illegible] رہے تو شاید میرے ساتھ بھی بارش انجوائے نہیں کی ہو۔"

"مجھے بارش اچھی نہیں لگتی۔" وائم نے سر جھکا لیا۔ وہ ایک [illegible] ہنسے اور پھر بولے۔

"[illegible] تجھے میں اچھا نہیں [illegible] اچھی لگنا بند ہو گئی کیوں؟"

"کچھ چیزیں بس اچانک ہی [illegible] ہو جاتی ہیں اچھے لگتے۔"

"جیسے اچانک ہونے والی بارش۔" وہ ایک زوردار خوشی بھری قلقاری مار کر بولے۔ وائم نے گلاس ونڈو سے دیکھا، واقعی بارش ہونے لگی تھی۔

"چل یار بارش میں بھیگتے ہیں۔" وہ [illegible] لہرا کر یکدم اٹھ کھڑے ہوئے، وائم ان کے ساتھ کھنچا چلا گیا

UrduPhoto.com

تھا پھر وہ ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کھڑے تھے۔

"گاڑی میں نہیں جا رہے۔ میں نے شاہ زین بھائی کے بیٹے کو بلایا ہے' وہ گاڑی گھر لے جائے گا۔"

"تو ہم یہاں شہباز کے آنے تک کھڑے رہیں گے۔" اسے غصہ آیا تھا ان کی اس لاپروائی پر۔

"نہیں' میری گاڑی کی ایک چابی شہباز کے پاس بھی ہے' وہ ہینڈل کر لے گا۔"

انہیں کسی بھی بات سے پریشانی نہیں ہوتی تھی مگر اسے ہو رہی تھی "آپ اس سترہ سال کے بچے کو بلا کر یہ گاڑی ہینڈل کرنے کو کہہ رہے ہیں اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو؟"

"کبھی ایسا بھی سوچ لیا کرو۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے میری گاڑی استعمال کر کر کے اب اس کا ہاتھ بہت رواں ہو گیا ہے۔" انہوں نے وائم کے اس خدشے کو بھی رد کر دیا تو اس نے ایک نئی بات نکالی "رات کے آٹھ بج رہے ہیں اگر راستے میں ٹریفک پولیس نے پریشان کیا تو۔"

"نہیں کرے گا میرا نام ہی کافی ہے۔"

"آپ کوئی پرائم منسٹر ہیں۔ امریکن صدر کے چہیتے بھتیجے ہیں جو آپ کا نام ہی کافی ہے۔"

"بات تو یہ ہے وائم! میرا نک نیم ہی کافی ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے آج کل۔" وہ اسے بالکل خاطر میں نہیں لا رہے تھے اور وائم کو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"چھوڑیں نا ممی۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ ایک نئی فرمائش اٹھا لائے۔

"آپ کو پتہ ہے یہاں کی [illegible] کا ذائقہ؟" وہ پوچھنے لگے' پھر [illegible] وہ دوسرے شیشے کے پیچھے کھڑے [illegible] دیکھ رہے تھے۔

"ہو سکتا ہے کل [illegible] زیادتی کے لیے۔"

"آپ کی ساری [illegible] آپ کو شاہ میر یاد آ رہا ہے۔" وہ پھر ہنسنا شروع ہو گئے۔ انہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ زبردستی اسے بھی [illegible] رہے تھے' پھر وہ ختم ہو گئے

تھے اور اب وہ چٹنی کے گھونٹ لے رہے تھے۔

"خدا کا خوف کریں' سینہ جل جائے گا آپ کا۔" مگر سنتا کون ہے! وہ چٹنی کے بعد پانی لے کر کے چٹنی کی تیزی سے پریشان تھے۔ "آئس کریم کھائیں؟" وائم نے جل کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"گڈ آئیڈیا' چلو اسی لین میں پشاوری آئس کریم پارلر ہے' وہاں لا کھڑی بیٹھ کر آئس کریم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

"ڈیڈی! تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے میں سالوں بعد آپ سے ملا ہوں' روز ہوتا ہوں آپ کے ساتھ یار! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"کچھ نہیں مگر ایک بات یاد رکھنا' جو آپ کے ساتھ روز ہو' آپ کے شب و روز میں گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح شامل ہو ضروری نہیں وہ واقعی دل سے بھی آپ کے ساتھ ہو' آپ کے پاس ہو' کیا پتا وہ صرف آپ کے ساتھ یوں ہی گھسٹتا پھر رہا ہو۔"

وائم کو یکدم کچھ عجیب سا لگا مگر وہ کچھ نہیں بولے تھے' وہ اپنی آئس کریم ختم کر کے اٹھے تھے اور آرڈر بوائے کو گھر کا پتا سمجھانے لگے۔

"آپ میرے ساتھ نہیں چل رہے؟"

وائم واقعی خفا ہو گئے تھے اس کے رشتے پر مگر انہوں نے اس کا دل رکھ کر کہا تھا۔

"بے منت کر رہا ہوں' بیٹا تمہیں آسانی سے گھر پہنچا دے گا۔" [illegible] پھر آہستگی سے بولے۔

"اتنی دیر برداشت کرنے کا شکریہ میری جان!" اب ان کی پشت تھی اس کی طرف۔

"آپ کہیں نہیں جا سکتے ڈیڈی!" وہ قدرے بلند آواز میں بولے۔

"نہیں بیٹے ایک بہت ضروری کام ہے۔ بابا سے کہہ دینا تھوڑی دیر ہو جائے گی آنے میں۔" آواز کی تیزی اور شاہ میر کا [illegible] ختم ہو چکا تھا۔ وائم نے کچھ دیر تو سوچا مگر پھر ساری توجہ گھر پر لگا دی' [illegible] کی آنکھ جس طرح کا تجربہ پکا تھا اس لیے اسے منانے کے لیے لفظ جوڑ رہا تھا۔

* * *

وہ تیز قدموں سے بارش میں بھیگتے ہوئے جا رہے تھے جب بہت اچانک ان کے قریب ایک کار آ کر رکی پھر جو شکل ان کو نظر آئی تھی اسے دیکھ کر وہ جی جان سے جل گئے۔

"اتنی بارش میں کہاں گھومتے پھر رہے ہو، تمہیں پتا بھی ہے کیا وقت ہو رہا ہے اور یہ کراچی کی بارش ہے اتنا پانی تو ہے سڑکوں پر یہاں میں اٹک کے پڑے رہتے ہیں اور۔"

"پلیز زمان بھیا! کچھ نیوز کے لیے بھی رہنے دیجیے۔" لمحہ بھر رک کے پھر مزید بولے۔

"کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

"نہیں مجھے اپنی گاڑی خراب نہیں کروانا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں آٹو کرا دے سکتا ہوں۔"

"چلیے لگا لیے کرایہ۔" وہ یکدم ہاتھ پھیلا کر شرارت سے بولے۔

اور شاہ زمان ہنستے ہوئے والٹ نکالنے لگے "سو روپے کافی ہیں؟"

"سو روپے میں کیا ہوگا جیسے پانچ سو روپے تو دیں۔" وہ منافقت سے بولے۔

"تم کیا کرتے ہو اتنے پیسوں کا؟ جب دیکھو ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوتے ہو۔"

وہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگے تھے پھر ہنس کر بولے

"آج کل دنیا میں غیروں کے ساتھ بیٹھنا ہو تو اس لیے ہاتھ کھلا زبان خاموش ہوتی ہے۔"

"خوش فہمی ہے کہ تم خاندانی کا حصہ ہو۔" شاہ زمان نے نخوت سے والٹ واپس لیے بغیر بولے۔

"بدتمیزی کرنے سے بہتر ہے خوشامد ہی پالی جائے ویسے سب بھائیوں میں آپ سے بہت زیادہ ٹھیک لگتے ہیں۔"

iUrduPhoto

شاہ زمان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ کوئی نشے میں ہو اور آپ اس کی تعریف کر دیں تو وہ بگڑ ہی جاتا ہے۔

انہوں نے کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھائی اور وہ اسی طرح سڑک پر بارش میں نہاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ٹریفک بری طرح جام تھا جس کی وجہ سے وہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بمشکل کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ ہی گئے۔

"تم کہاں نکلے ہوئے تھے؟ دائم تو کب کا گھر آچکا ہے۔" نیلوفر بھابھی نے ان کے لتے لیے۔ وہ گیٹ سے آگے آنے کے بجائے چوکیدار کی کرسی پر ہی بیٹھ گئے۔

"سانس تو لینے دیں بھابھی ماں! ہماری [illegible] تبادلہ ہوا تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

چوکیدار شیڈ کے نیچے کھڑا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہے تھے گھر کی بڑی عورتیں جا چکی تھیں صرف نیلوفر بھابھی کھڑی تھیں، جو اطلاع پا کر اماں جان بھاگی ہوئی آئی تھیں۔

"کتنا بھیگ گیا ہے شاہ میر چل جلدی سے کپڑے بدل لے ورنہ بیمار پڑ جائے گا۔" اماں تیزی سے کھینچ کر انہیں اندر لے گئی تھیں وہ تولیے سے ان کے بال خشک کرنے لگیں۔ نیلوفر بھابھی ان کا [illegible] اور [illegible] لائیں۔

"تمہیں پتا ہے تم بیمار پڑ جاتے ہو بارش میں بھیگ کر پھر بھی بارش انجوائے کرتے ہو۔"

نیلوفر بھابھی بتا رہی تھیں اور وہ اس کے واش روم میں کپڑے لے کر گھس گئے۔ پانچ منٹ بعد باہر آئے تو اماں چائے کا مگ ان کے واسطے رکھ رہی تھیں۔

وہ چائے پینے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ نیلوفر بھابھی ان کے لیے پیناڈول لے آئیں "کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے گولیاں نگل گئے اور ادھر ان کے کمرے میں جھانکتی بالکنی کی طرف والی کھڑکی سے جھانکتے دائم کو ان کی اتنی خاطر مدارات دیکھ کر رونا آگیا۔

"پتا نہیں ان سب کو کیا دکھتا ہے شاہ میر میں۔"

اس نے بہت الگ طرح سے آج شاہ میر کے بارے میں سوچا تھا۔ یہ وہ سوچ تھی جو اس گھر میں بہت

سارے ذہنوں میں پیدا ہو جاتی تھی۔

وہ باہر کوریڈور میں کرسی پر بیٹھا بارش کو برستا دیکھ رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ میر کو کچھ دیر کے لیے نہ دیکھے۔ صبوحے ابھی ابھی اس کی بات ہوئی تھی اور وہ اس پر شک سے الٹ پڑی تھی کہ شاہ میر نے اس کی آواز سن کر فون کاٹا تھا اور یہ کہ وہ کون ہوتے ہیں کام تمام بانٹنے والے اس نے کہا کہ وہ صرف اس کے چاچو ہی نہیں اس کے دوست بھی ہیں مگر اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

"دوست محبوب کی جگہ نہیں لے سکتے۔" آخری فقرہ اس کا یہی تھا اور وہ اس وقت بھی صبوحے کے اسی فقرے کے ساتھ اکیلا بیٹھا تھا۔ دل بے چین تھا۔ بوگن ویلا کی جھری اسٹوری ان کے دماغ میں اودھم مچائے پھر رہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"یہ آج کل تم پرانی فلموں کی سوتیلی ماں کی طرح ہونٹ کیوں کاٹتے رہتے ہو۔"

"مجھے آپ سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"خیریت ہے نا [illegible] آج موسم اتنا گرم کیوں ہے؟"

"آپ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جب آپ کا دل چاہے میں بات کروں آپ کا دل چاہے میں چپ رہوں آپ کے ہاتھوں میں کوئی کھلونا ہوں کوئی [illegible]؟"

شاہ میر سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتے رہے پھر یکدم اسے کچھ کہے بغیر وہاں سے غائب ہو گئے۔ وامق نے تو صبوحے کے غصے میں آ کر [illegible] کیا مگر اب اسے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی زیادتی تھی وہ بہت [illegible] خان کے ساتھ۔

پھر دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر بھی وہ نظر نہیں آئے تو اسے حیرت ہوئی رات کو وہ اس وقت کمرے میں آئے تھے جب وہ سو گیا تھا اور جب اٹھا تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔

"شاہ میر کہاں ہیں...؟" اس نے دادی جان سے پوچھا۔

وہ فکر مندی سے بولیں "پتا نہیں کل سے کیا ہو گیا ہے، کچھ بول ہی نہیں رہا بس خاموشی سے آفس کے کاموں میں لگا ہوا ہے۔"

"آؤٹ ہاؤس میں ہیں کیا؟" شاہ میر اور آفس کے کام پہ اسے حیرت ہوئی دادی نے آہستگی سے سر ہلایا اور وہ ناشتے کی ٹرے لے کر آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ابو جان شاہ میر کو کچھ ڈکٹیٹ کروا رہے تھے اور وہ ان کے لفظوں کو ای میل میں ڈھال رہے تھے۔

"السلام علیکم بابا!" وامق نے باآواز بلند سلام کیا۔ شاہ میر نے ذرا بھی توجہ نہ دی تو اسے دھکا سا لگا۔

"کیا آپ بہت مصروف ہیں شاہ میر؟"

"جی بابا! ان سائٹ اینڈ سائنس کے سلسلے میں بھی آپ کچھ کہہ رہے تھے انھیں بھی ای میل کرنا ہے؟"

"نہیں بیٹا ان سے کل بات ہو گئی ہے وہ معاملہ حل ہو گیا ہے بینک میں کچھ لیٹ تھا اس کا چیک اپرو ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا! پھر میں چلتا ہوں مجھے آج کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ رات کو بھی بہت دیر ہو جائے گی۔"

وامق کو پھر رات اور دیر جیسے لفظوں نے دھکا دیا تھا۔

"آپ کبھی کبھی [illegible] حد کرتے ہیں۔ پتا نہیں اچھے بھلے راستوں پہ چلتے چلتے کس کس کی خاک چھانتے نکل پڑتے ہیں۔" ابو جان بولے تو وہ ناشتے کی ٹرے واپس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اکیلے ناشتے کی اسے عادت تھی مگر شاہ میر کے ہوتے ہوئے اکیلے ناشتہ کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا اور وہ خود بھی اس کے بغیر ناشتہ نہیں کر سکتے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے، میرا ایک ریسٹورنٹ ہو جس کے وسیلے سے بھوکے لوگ ہر وقت کھانا کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔ اکیلے ناشتہ کرنا بڑا عجیب لگتا ہے۔"

وہ جس سے پوچھ رہا تھا اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ اس نے صرف ایک سلائس کھایا تھا اور ٹیرس پر آ کر بیٹھ گیا۔ بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بہت مدھم سی مترنم آواز نے اسے چونکا دیا۔

"عائشہ باجی! آپ اتنی اچانک۔"

"بس یونہی سوچا تھا گھر سے مل آؤں۔ مگر اس بار جب سنا تم آئے ہو تو میں نے کہہ دیا ایک ہفتہ رکوں گی۔ [illegible] کے گھر آئی ہوں لیکن تمہیں بچوں کی ٹولی ایک ساتھ کیوں نظر نہیں آ رہی؟ ماموں جان کہہ رہے تھے، بہت مصروف رہنے لگا ہے شاہ میر۔"

"ہاں نہیں مجھے بھی یہ اطلاع دادو جان سے ہی ملی ہے آج۔"

"کیا بات ہے، تم اور اس کے ذکر پر اتنے اکھڑے اکھڑے سے ہو۔"

"بس یونہی عائشہ باجی! اوپر تھوڑا بور ہو رہا تھا۔"

"واہ! تم اور بور ہونے لگے۔ شاہ میر اور تمہارے قصے تو اب تک ہم لوگ مزے سے دہراتے ہیں۔ سارے بچے تمہارے دیوانے ہیں بھئی۔"

وہ دھیمے سے مسکرا دیا تھا اور وہ ہنس کر بولیں۔

"آصفہ کی شادی ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی۔ سب کتنا حیران پریشان تھے اور شاہ میر دس برس کے ہو کر بھی کیسے چپ ہو گئے تھے۔"

وہ سب یاد کر رہا تھا۔ اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی تھی۔ آصفہ باجی کی شادی پر انہوں نے کتنے [illegible] کر دیے تھے۔ چھوٹے چھوٹے [illegible] بارات میں نقص نکالتے۔ بچوں کے سامنے تو چپ رہتے مگر آصفہ باجی کو تنگ کرتے۔ [illegible] ہمیں ابھی ان کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا [illegible] بہت [illegible] میں نہ آئیں، چک پھیریاں لگاتے ایسے لڑکے تیز اور دل پھینک ہوتے ہیں۔

"ہاں تم سب عمر سے بڑی باتوں پر ہکا بکا رہ جاتے مگر تحقیقات میں جب کوئی نقص معلوم ہوتا ان کے کہے ہوئے لفظوں سے انہیں میں کا فرق ہی ہوتا۔"

پھر آصفہ باجی کی شادی طے ہوئی اور انہوں نے وہ ہنگامہ کیا کہ الامان۔ میرے رنگ والے یہاں تک کہ شادیوں کی وہ جان بن گئے۔ بس باقی لڑکوں کا داخلہ ممنوع ہوتا۔ شاہ میر ہمارے ہوتے۔ جب آصفہ باجی کی شادی ہوئی تو اس وقت شاہ میر کتنے ہی تھے، انہوں نے صرف آپس میں تین دن ڈھولکی کی قرارداد پیش کی۔ بات بابا جان تک پہنچی تو سب گئے۔

"شاہ عالم کے گھرانے کے لڑکے گانا بجانا نہیں کرتے۔"

وہ بابا جان کے سر ہو گئے۔ "چلیں بابا جان! تین دن تک بھول جائیں ناں، آپ شاہ عالم ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟ میں یہ بھول جاؤں کہ میں شاہ عالم ہوں تو پھر کیا یاد رکھوں؟"

"آپ خود کو شہزادہ سمجھتے تھیں۔ ہائے بابا جان! یہ نیا زمانہ ہے [illegible] بے چاری لڑکیاں [illegible] کے ارمان [illegible] باجی ہیں [illegible] عائشہ باجی اور آصفہ باجی کی طرح پھر [illegible]" بابا جان نے ان کی صورت دیکھی [illegible]

"اوکے! [illegible] ایک بھی آواز [illegible]"

یوں شادی کے دن بے حد یادگار ہو گئے تھے۔ وہ ساری ساری رات باتیں کرتے۔ اس دن چچی جان [illegible] آ گئیں۔

"بچوں کو آرام کرنے دو۔" اور وہ منع کر دیتے۔

"پلیز امی جی! ابھی ہی تو [illegible] جب ہم ان کے پاس اتنے دن سے بیٹھے ہیں، پھر تو بھئی صاحب ہوں گے اور ان کی بیوی حضور۔"

"آصفہ باجی جو دولہا کے جیسے ہاتھوں پہ خاموش عہد تھا کہ وہ ماؤں کے بوجھ سمجھنے کی ضد نہیں کریں گے۔ سب کزنز اور بہن بھائیوں نے اسی خاموش عہد پر

دستخط کر رکھے تھے۔ وہ سب باتوں میں مگن رہتے۔ شاہ میر آصف باجی کے بعد اب عائشہ باجی کی خدمت داری کر رہے تھے جو فرمائش منہ سے نکلتی "فورا" پوری ہونے لگی تھی۔ عائشہ باجی بھی حیران تھیں۔

وہ اتنے دھڑلے سے خرچ کر رہے تھے کہ دائم کو شبہ ہوا انہیں شاہ میر آج کل ہاتھ کی صفائی تو نہیں دکھانے لگے ان کو کسی دن جب ہوئی تو ان کی غیر موجودگی میں اس نے ان کی الماری کھنگال ڈالی۔ تب وہ ہکا بکا رہ گیا آمنہ باجی، عائشہ اور نور باجی کے جہیز کے منی باکس رکھے تھے انہیں لاک کیے ہوئے اور ہر باکس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے یہ رقم جمع کر رہے تھے اور اب شادی کے بعد بھی یہ باکسز خالی نہیں ہوئے تھے۔

"کیوں شادی کے بعد آپ پیسے کیوں جمع کرتے ہیں؟" رات گئے اس نے پوچھا تو وہ مسکرا کر بردباری سے بولے۔

"بعض چیزیں بار بار اتنا سوال ہو جاتی ہیں، آنے کی بات پر خوش ہو جاتے اور اتنی سی بات پر روٹھ جاتے اپنا پن کسی ضرورت ہوتی ہے ان کی۔ اگر کبھی ان کی پروا کرنے کے لیے صرف غلطی پھر میری طرح اتنی اور غلطی دونوں ان کے اندر کا وہاں ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور جب وہ ان بچار رہتا ہے تو جو لڑکی کے اندر وہاں بھی اوپر رہتا ہے۔ آخر انہوں نے سب کچھ ان کے سنتے سے چٹکیاں اڑا رہے۔ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ ان کے اندر کی لڑکی ہر وقت مسکراتی رہے۔"

کتنا پیار کرتے ہیں۔ شاہ میر آن سب نے آج پھر ٹھیک طرح سے سوچا تھا وہ شخص بہت عجیب سی تھی۔ عائشہ باجی بات بات پر ان کی باتیں کر رہی تھیں اور وہ ان کی بھولی بیٹی کو گود میں لیے ماضی کو سوچ رہا تھا ایک شخص جو دنیا کی پروا، رشتوں کی پروا سے افضل نہیں سمجھتا وہ کیسے کرپٹ ہو سکتا ہے۔ دل

نے مشورہ دیا اور اس نے ایک بار پھر سے شاہ میر کی تلاش شروع کی لیکن جب تک وہ آفس پہنچا وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔

"میں کچھ بھی کہہ کر مناؤں گا نہیں۔ میں غلط تھا۔ ہر رشتے کی قدر حیثیت دوسرے رشتے سے الگ سی مگر ضروری ہوتی ہے۔ ایک رشتے کو نبھانے کے لیے پہلے کے کسی رشتے کو گنوا دینا عقل مندی تو نہیں۔"

وہ سوچے جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا پھر وہ چونک گیا۔

"اسپتال۔۔۔ کیوں؟" ایک بیاسا کیوں اس کے اندر ڈنک مارنے لگا۔

"ہو گا کوئی جان پہچان کا بندہ ڈیڈ مست شاہ میر کو بھی تو ہر کسی سے خلوص اور محبت کی پینگیں بڑھانے کی عادت ہے۔ ہر آتے جاتے چلتے پھرتے شخص سے انہیں انسیت ہو جاتی ہے۔"

وہ گاڑی سے باہر آیا اور فاصلے سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔

یہاں تک کہ انہوں نے کوریڈور میں چلتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو روک لیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں شاہ میر! میری آپ سے اپنے کیس کے سلسلے میں بات ہوئی تھی۔"

"اوہ ہاں، اوکے مسٹر جی کا کیس ڈسکس میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ چل کر میرے روم میں بیٹھیے۔ میں بس چند منٹ میں آپ کے پاس آتا ہوں۔"

دائم ٹھنڈے کوریڈور میں یکدم ساکت ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ جس چیز کی تلاش میں تھا جس کا پوسٹ مارٹم وہ بار بار کر رہا تھا۔

ہراس اور تکلیف کا احساس کب ہو جاتا ہے اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تھا۔

"سوری سر! اسموکنگ الاؤ نہیں ہسپتال میں۔"

اس کے چہرے پاس سے ہاتھ ہوا۔ سگریٹ شعلہ دکھانے والے تھے یکدم بے جان ہو کر پھر سے گر گئے تھے۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور اپنی کار کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر

اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے مگر آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

وہ کوڑی سی سائیڈ پر لے گیا تھا پھر پتھر پر بیٹھ کر تکتے ہی منظر اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے تھے۔ جو ماضی میں واقع ہوا تھا اور شاہ میر اس کے لیے لڑ رہے تھے۔

"نہیں اگر دائم شامل نہیں ہو گا کرکٹ میں تو میں بھی نہیں کھیلوں گا۔"

"چاچو! دائم بھیا کی بیٹنگ فیلڈنگ بولنگ کچھ بھی نہیں اچھی۔ آپ بلاوجہ ضد کرتے ہیں۔"

"نہ ہو کچھ بھی اچھا مگر یہ میرا شیر ہے جہاں میں ہوں گا وہاں یہ ہو گا جہاں یہ ہو گا وہاں آف کورس میں ہوں گا۔"

"نہیں چاچو! آپ کچھ بھی کہہ لیں ہم دائم بھائی کو نہیں کھلائیں گے۔ ایک تو پہلے یہ کھیلتے ہیں پھر جب ڈانٹ پڑتی ہے تو سائڈ پہ جا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ الٹی ہم سب کی شکایتیں لگاتے ہیں دادو جان اور بی جان کو۔"

"کیا ہو گیا یار! بچہ ہے بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔"

"کیسے؟ آپ کو کیسے پتا؟ سیاست دان بھی ایسے کرتے ہیں؟ بچوں کی طرح [illegible] کرتے۔"

"ایک نمبر کے سیاست دان [illegible] شوق [illegible] سب [illegible] دونوں ہاتھ [illegible] اور جب پکڑ دھکڑ شروع ہو تو [illegible] کر اپنی حکومت میں سیٹ لینے کے بہانے سارے پرانے جرائم اور کرپشن کے [illegible]"

"بی جان بھی آپ کہتے ہیں یہ تو ان کا اختیار ہے۔"

"بی بی [illegible] ہمارے [illegible] سیاسی [illegible]"

اس نے [illegible] کو [illegible] کیا۔ [illegible] تھا پھر بی جان اور دادو جان [illegible] اور [illegible] تو [illegible] سخت لہجہ [illegible] بھی [illegible] لائے ہوں۔

اسے [illegible] شاہ میر [illegible] لڑکیوں میں مقبول رہنے کے لیے [illegible] تھی [illegible]

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی پھر اسے وہ دن یاد آیا جب ایک بہت ذہین طالبہ کے نوٹس کی [illegible] پر اس نے ان سے کہا تھا۔

"مجھ سے محبت کرتے ہیں تو اس کے نوٹس لا کر دیں۔ میں اپنی حیثیت اس کالج میں بہت شاندار چاہتا ہوں۔"

اور شاہ میر [illegible] تک اس لڑکی سے مل بیٹھے تھے پھر وہ اسائنمنٹ کے لیے صرف [illegible] اور اس کا اسائنمنٹ بغیر محنت کے وقت پر تیار ہو گیا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ اس سے دور ہو گئے تھے۔ ان کا [illegible] بڑی [illegible] راتوں کو بھی [illegible] رہے تھے۔

"محبت کا چکر ہے۔" اس نے ہنس کر انہیں بھائی کے سامنے کہا جانا تھا وہ یہ خبر پورے گھر میں نشر کر دیں گے [illegible] آگے نہیں بڑھی تھی۔

"کالج میں یونیورسٹی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ شاہ میر بہت سمجھ دار ہیں۔"

"ہو گی [illegible] اس [illegible] لڑکے کے ساتھ [illegible] کو [illegible] نہیں [illegible] شاہ میروز کی بات [illegible] نہیں چاہیے [illegible] کے بعد [illegible] یہاں [illegible] بس طے ہو گیا [illegible] اسلام آباد [illegible] اپنا [illegible] شاہ میر [illegible] ان کے حق میں بہتر ہے۔"

"مت جاؤ نا!" وہ کمرے میں آیا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہا۔

"بابا کا فیصلہ ہے شاہ میر [illegible]"

"اگر تم [illegible] تم نہیں جانا چاہتے تو بابا بھی ضد نہیں کریں گے۔" انہوں نے اسے [illegible] دائم [illegible] کی آنکھوں میں [illegible] جس عمر میں [illegible] تھا اس میں انسان [illegible] بھی معاملے تھوڑا خود غرض ہو ہی جاتا ہے۔

"میں تمہارے بغیر کیا کروں گا کالج میں۔"

"کیوں کالج میں تو آپ کی لڑکیوں میں بڑی دھوم ہے پھر وہ لڑکی [illegible] بھی تو ہے۔"

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCI

"میں نہیں جانتا کسی رائٹ شاہد کو۔ میں اس کے پاس صرف تمہارے نوٹس لینے کے لیے گیا تھا مگر بشیر نے صاف منع کر دیا۔"

"پھر وہ سال بھر نوٹس کہاں سے آتے رہے؟" وامق حیران ہوا تھا مگر شاہ میر کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے۔

"تیرے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں میری جان۔" ہر معاملے' ہر فرمائش پر ان کا یہی جواب ہوتا تھا اور اب وہ کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے تو اس کے اندر یہ فقرہ کسی شرارتی بچے کی طرح دوڑتا پھر رہا تھا۔

"بہت تھک گیا ہوں یار سونے دو۔" یہ وہ جملہ تھا جو پھر اس نے سارا سال سنا تھا اور پھر ان کی تھرڈ ڈویژن آنے پر گھر میں ہنگامہ ہوا تھا۔

"تم تھک جاتے ہو یا کس کو دیتے؟"

"کوک کی بوتلیں ٹن کرتے۔" وہ شاہ زمان چاچو کی بات کا اثر لیے بغیر بولے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کوک کی بوتلیں ٹن کرنے کا مطلب؟" وامق [illegible] تمہارے چاچو کیا کرتے تھے [illegible]؟"

"چچو [illegible] کی ایک بوتل [illegible] میں [illegible] کی ایک [illegible] اسٹوڈنٹ کو۔"

"یہ کوئی اتنا [illegible] ہے [illegible] تمہارا نانا؟ بچے اس لیے بات [illegible]" شاہ زین بھی ہنسی سے [illegible] اور وہ [illegible] سے [illegible]

"چاچو یہ اتنا میرا قصور نہیں ہے تو ایک اوپن [illegible] نفرت ہو گئی انسانی رقم جمع کرنا چاہتے ہیں [illegible] نہیں دیتے کمینیاں۔"

"مگر شاہ میر! تم تو ان بچوں کے لیے ولی ہو تو پھر تم [illegible]؟"

"تیرا [illegible] میں ولی نہیں [illegible]۔" ایک نیا [illegible] جواب آیا۔

"مگر [illegible] میں [illegible]" [illegible] سے چپ [illegible]

"مجھے سوشل ورک کا شوق ہے بچپن سے نہیں ہو تمہیں یہ پتا نہیں۔ سوشل ورک کے لیے انسان کا حساس ہونا ضروری ہے اور وہ میں ہوں۔"

"سوشل ورک کوئی کام نہیں ہوتا آپ یونہی بچوں کو آگے پیچھے کر کے کیا کھلاؤ گے سوشل ورک کی برائی یا سوشل ورک کی شہرت تھی؟" شاہ زمان چاچو کا غصہ دیدنی تھا اور شاہ سروز کو جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔

"تم نے پچھلے ٹرم میں چیٹنگ بھی کروائی تھی جس کی وجہ سے اس بار تمہارا گزرا اعزاز میں بیٹھنا بھی ناممکن تھا۔ وہ تو پرنسپل صاحب نے ٹھیک نوٹ کر لیا اور میں نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔"

"چیٹنگ کیوں کروائی تھی؟" اس پہ سوال سامنے آیا اور شاہ میر گھر سے اٹھ گئے۔

"اپنا بکرا چیرتے رہا تھا میں نے کہا کوئی پرابلم نہ ہو اسے اس لیے بولیاں ہوئیں اور تنگ کیا کام سے اس نے تو منع نہیں کیا مگر میرے اسٹوڈنٹس نے دلچسپی دکھائی تو میں نے وہ ساری بوتلیں وہیں چلا دیں لوگ ایک بوتل کے سو روپے لے رہے تھے میں نے پانچ سو روپے میں دے کر پرافٹ کمالیا اب یہ کوئی بری بات ہے؟"

سب [illegible] تو [illegible] ہو گئے [illegible] وامق بھی حیران رہ گیا تھا۔

"اتنے بڑے [illegible] ہو گئے شاہ میر۔" کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا تب شاہ زین چاچو نے کہا۔

"اچھا تو یہ [illegible] بتاؤ کون سا سوشل ورک ہے۔"

شاہ میر نے شرارت سے دیکھا "دیکھیے اتنی بڑی کتاب سے مختصر [illegible] کروا کے پھر [illegible] پھیلا دیا ہے اور [illegible] تک [illegible] سوشل ورک چلتا ہے۔"

[illegible] "واہ [illegible]" [illegible] تھی۔

"کسی کی مدد کرنا [illegible] تو ہے بابا!" رحمان [illegible] کیا اور وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ شاہ میر وہیں بیٹھے رہے [illegible] شاہ سروز گلہ کر رہے تھے۔

"دیکھ رہے ہیں نا بیاوہ کتنا بگڑ گیا ہے اسے اچھے

UrduPhoto.com

بڑے غلط تھے ان کی تیزی بھی ختم ہو گئی ہے۔ باقی چھوٹے بچے اس سے کیا سیکھیں گے؟ نیلو فر ٹھیک کہتی ہے، دائم اس کے ساتھ رہا تو یہ بھی بگڑ جائے گا اور میں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے بہت اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔"

دادو جان سر جھکا کر رہ گئے۔ دوسرے دن وہ کالج گیا۔ کالج کا ایک لڑکا شاہ میر سے بہت زیادہ ریشہ خطمی ہو کر مل رہا تھا۔

"شکریہ شاہ میر! اگر آپ اس چیٹنگ اسکینڈل سے مجھے نہ بچاتے تو میری ماں تو یہ صدمہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی پتا نہیں کیا سوجھی تھی مجھے شارٹ کٹ مارنے کی۔"

شاہ میر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر نرمی سے بولے "شکریہ تو مجھے تمہارا کرنا چاہیے اگر تم مجھے دائم کے نوٹس بنوانے میں ہیلپ نہ کرتے تو میرا گریڈ اے پلس نہیں آنا تھا۔"

"ہاں شاہ میر! اس وقت آپ سے کی تھی میں نے تو صرف [illegible] جانے تھے، ساری کتابیں [illegible] سب [illegible] تو ساری آپ کی محنت ہے۔"

دائم کا ان دنوں [illegible] چیٹنگ سے [illegible] آگیا تھا [illegible] یہ سب [illegible] ساری باتیں [illegible] راز [illegible] ان باتوں پر کسی سے [illegible] نہیں کرتا تھا شاید وہ [illegible] آنا چاہتا ہو [illegible] بے چارے اس لیے اس سے [illegible] تھے [illegible] ہوتے تھے اور اس سے [illegible] تمہیں جمع کرنے [illegible] اور وہ ان کی اس [illegible] میں [illegible] بہت ظفر کے سر [illegible] تھا۔

"[illegible] ناں ظفر بھائی! شاہ میر کتابوں کے پیسے کہاں سے لاتے ہیں۔"

"وہ زمین [illegible] باپ دادا کی [illegible] لیکن شاہ میر تو [illegible] وقت کا [illegible] میں ہو گی۔"

"پھر وہ [illegible] ناں کیا کرتے ہیں وہ روز ان پیسوں کا؟"

ظفر بھائی نے ادھر ادھر دیکھا اور بولے "میرے پاس ایک منی باکس ہے شاہ میر روز کے پیسے وہاں جمع کراتے ہیں پھر ایسے اسٹوڈنٹس وغیرہ کی مدد کرتے ہیں جنہیں پیسوں کی ضرورت ہو مگر اس کی جیب اجازت نہ دیتی ہو، وہ کم آمدنی والے گھرانے کے بچوں کو کتابیں اور دیگر چیزیں مہیا کرتے ہیں۔"

"روز کے پیسے جمع کرنے سے اتنی رقم جمع ہو جاتی ہے؟" اسے حیرت ہوئی۔

"نہیں شاہ میر اپنی پاکٹ منی کا ایک اچھا خاصا حصہ بھی ڈالتے ہیں پھر ہم سب دوستوں کا گروپ بھی اس میں حصہ ڈالتا ہے سو اب تک اچھا خاصا کام کر چکے ہیں۔ اس بار پرنسپل سے مل کر کالج میں ایک پیڑ کے سامنے [illegible] اپنا [illegible] بھی لگایا ہے۔ [illegible] کا سوال ہے [illegible] آدھی قیمت میں لے کر ضرورت مند اسٹوڈنٹس میں تقسیم کرتے ہیں [illegible] غریب [illegible]

"اچھا تب ہی پرنسپل صاحب نے [illegible] شاہ میر [illegible] پرنسپل صاحب بہت [illegible] اور [illegible] تھے۔"

"بابا تو خوش ہیں کہ [illegible] کی عزت اور [illegible] ہے اور وہ ناراضی سے اپنا کالج [illegible] دوسرے کر الگ کھڑے تھے۔ [illegible] اسے [illegible] مل کر [illegible] یہ صرف شاہ میر جانتے تھے تب ہی تو ان کا [illegible] کرتا تھا اور یہاں [illegible] رہتا تھا۔ وہ ہر وقت ان کے ساتھ [illegible] اسے بھی [illegible] پتا تھا۔

"میں [illegible] شاہ میر کو تلاش کرتا ہوں۔" اس نے گہرا لمبا سانس کھینچا اور ناگواری سے گھر آگیا۔ غیر متوقع طور پر شاہ میر اسے ڈرائنگ روم کے سامنے کھڑے نظر آئے، ڈارک براؤن کرتا سفید شلوار میں ان کا رنگ کھل رہا تھا۔

"کہیں جا رہے ہیں؟" اس کی بڑی بڑی آنکھوں نے اس کے خدوخال کو آشنائی سے چھوا مگر وہ چپ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بولے نہیں تھے۔

"شاہ میر! ابھی تک خفا ہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور یکدم ہراساں ہو گیا۔

"آپ کو اتنا تیز بخار ہے۔"

"آپ کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ سنا آپ نے۔" اس نے کمرے کو لاک کر دیا تھا مگر وہ آہستگی سے کولیا پوری پیکن رہے تھے۔

"اگر آپ نہیں رکے تو میں وڈی جان کو بلا لوں گا۔"

"جاؤ! اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔" یہ پہلا اور آخری جملہ تھا۔

"آپ مجھے تو لے جا سکتے ہیں ناں۔" وہ بے بسی سے منت پر اتر آیا تھا۔

"عین موقع پر ساتھ چھوڑنے والوں اور اعتبار نہ کرنے والوں کو میں کہیں نہیں لے کر جاتا۔"

"آپ کو پتا ہے اگر آپ مجھے ٹینشن دیں گے تو پھر خود بھی پچھتائیں گے۔"

یہ اس کا آخری حربہ تھا وہ بھی کبھی ضد پوری کروانے کے لیے وڈی جان، بابا جان یا ماموں کے سامنے اڑ جاتا تھا۔ خود کو دبا کر یا تھکا کر اور ٹینشن سے اس کے دل کی دھڑکن بے حال سی ہو جاتی تھی۔ اس کی طبی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہزار بار کے ٹیسٹ یہی کہتے تھے مگر اس کے بچپن کا یہ مسئلہ آج تک برقرار تھا۔

شاہ میر نے اسے ایسا کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑنے دی تھی وہ ہمیشہ ماموں کے گھر رہا تھا اور نیلوفر بھابھی اس کے متعلق کبھی اپ سیٹ کسی کو بتانا ٹھیک نہیں سمجھتی تھیں۔ یہ ان کے بیٹے کی کمزوری تھی اور وہ بھی میں ان کمزوری کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"شاہ میر! آپ اگر اکیلے گئے تو [illegible] مر جاؤں گا۔" اس کا سانس تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ شاہ میر نے چہرے سے مڑ کے اسے دیکھا اور بیڈ پر بیٹھنے سے یکدم گر گیا تھا اس کے سانس

لینے کی آواز بہت تیز تھی۔ کیا غضب کیا! کا نعرہ شاہ میر یکدم بھاگ کر اس کے پاس دوڑے آئے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے پاگل! ابھی تو اچھا بھلا تھا۔" انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اس نے شاہ میر کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔

"آپ ابھی تک خفا ہیں مجھ سے۔" اس سے اتنا بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ان کے کندھے پر آنکھیں رگڑی تھیں اور شاہ میر ہونق رہ گئے۔

"بھاڑ میں گئی ناراضی یہ ہوا کیا ہے؟ بچپن میں لالہ جان سے سنا تھا ضد میں لمبی سانس کھینچتا ہے نیلا پیلا ہو جاتا ہے مگر اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے تیری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔"

"ہاں زیادہ اب ڈیٹ ہو گئی ہے۔" وہ پھیکا سا ہنسا شاہ میر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر درود پڑھنے لگے۔ اس کی دھڑکنیں آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی تھیں۔

پندرہ منٹ بعد وہ بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔

"کوئی ٹیبلٹ لیتے رہتے ہو اسے۔ کون سی؟"

وہ سرہانے سے ٹیبلٹ نکال کر کھانے لگا تھا۔

"یہ تو انسلٹ کر رہا ریلیکس کرنے کی ٹیبلٹ ہے بہت ہائی M.G کی ہے۔ اور آئندہ صرف درود سے کام چلانا۔" انہوں نے اسے خود سے لپٹایا اور وہ بے ساختہ بولا۔

"آئی لو یو شاہ میر! آپ کی جگہ کوئی کبھی بھی نہیں لے سکتا۔"

"مجھے پتا ہے اسی لیے تو تمہیں رکھا ہوا تھا۔" وہ ہنسے اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کی طرح دونوں ساتھ ہی تھے۔

"یہ [illegible] وقت ان کو [illegible] کیوں [illegible]؟"

"اس لیے بھی کہ وہ دونوں چاند اور ہالے کی طرح ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی سجتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے الگ کریں گی تو دوسرا بے رنگ، بے ذائقہ ہو جائے گا۔"

نیلوفر بھابھی نے مڑ کر عائشہ کی طرف دیکھا مگر وہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

کے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

* * *

دائم ایک نچلے متوسط طبقے کی کلاس شادی میں شریک تھا اور اسے ایک بار پھر شرمندگی ہو رہی تھی اس نے شاہ میر کو کتنا غلط سمجھا تھا لڑکی کی شادی تھی اور شاہ میر اسے رش میں چھوڑ کر کہیں باہر گم ہو گئے تھے۔ بوڑھی عورتیں اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں اور وہ شال خان کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"آپ کا بھائی بہت کمال کا آدمی ہے۔ اس نے مجھ جیسے شخص کو سدھارا ہے یہ صرف وہی کر سکتا تھا۔ میں بہت برا انسان تھا۔ گھر کے حالات کی وجہ سے اتنا گرا ہوا کام کرتا تھا پھر ایک دن تمہارا بھائی ملا۔ ہم اسے بھی بلا وجہ سمجھا وہ روز ہمیں سمجھاتا ہمیں حالات سے لڑنے کے قسمت بدلنے کے نئے راستے بتاتا مگر وہ راستہ مشکل اور راستہ کٹھن تھا۔ جب حرام منہ کو لگ جائے تو محنت کرنے کو جی نہیں کرتا۔ ادھر بھی یہی حال تھا ہم قسمت کو اپنی ذمہ داریوں کو اپنے برے ہونے کی وجہ سمجھ کر [illegible] بنا ہوا تھا اپنے لوگوں کے قتل سے بڑا۔ وہ ہمیں بھی کی لڑی زندگی گزارتے تھے مگر حرام نہیں کھاتے تھے ہم اس کی باتوں سے چڑ جاتا اس سے دور جاتا وہ بہادر لگتا تھا ہم کو برداشت کرتا، وہ ہماری حالت دیکھ کر ہمیں سروس کی جگہ رکھتا ہمیں اچھی تنخواہ دیتا تمہارے بھائی کے نام کی وجہ سے جب رہتا تھا اور ہوٹل کے کمروں کا سروس عملہ اور وہ [illegible] کا سروس عملہ الگ الگ ہوتے ہیں [illegible] ہمیں ہی اتنی سی بیر ماہر کرتا۔"

دائم [illegible] اور شال خان نے مجھ سے کہا تھا

"اس دن بھی وہ ایسے ہی ڈائننگ ہال سے اٹھ کر ہمارے پیچھے آیا تھا۔ اس وقت ہم روم نمبر 7 کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک عبا میں ڈھکی چھپی لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"گل۔" اس کا لہجہ خاص فرنٹیئر کا تھا ہمارا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

"تم یہاں کیسے آیا؟" ہم اس پر چیخا تھا جب ہی روم نمبر 7 کا بوڑھا ہمارے سامنے آ گیا۔ اس نے گل کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔

"ہم کو یہی چاہیے۔" اور اس کا یہ جملہ سن کر ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

ہم اس آدمی سے لڑ پڑے۔ ہم نے اس کو مار مار کر بھرکس نکال دیا پھر ہم گل کی طرف مڑے تو اس نے نقاب اتار دیا ہم نے ٹھنڈی سانس لی ہم نے اس وقت سوچا ہماری معصوم گل اس شہر کے راستے کہاں جانتی ہے جو اتنے بڑے ہوٹل میں آ گئی یہ کوئی اور لڑکی ہے اور جب ہم پھر سے سنبھل رہا تھا تمہارا بھائی یک دم سے سامنے آ گیا اور نرمی سے بولا۔

"یہاں واقعی گل بھی ہو سکتی تھی کیونکہ ہم دن بھر جب کر گئے [illegible] ابھی نہ بھی [illegible] گھر کا راستہ ضرور دیکھتی ہے ہمارے گھر کے اندر داخل ہو کر ہم پر بیتی ہے اور کوئی ہے اب گھر جاؤ اور گھر سنبھالو تم کیوں بھول گئے اللہ کی بے آواز لاٹھی! دشمن کے مکافات عمل کو۔"

"ہم نے سنا اور ہم دیوار سے لگ گیا۔ پچھلی پوری زندگی کسی فلم کی طرح آنکھوں میں گھوم گئی ہم نے سوچا اگر واقعی یہاں کسی دن گل کھڑی ہو اور اسے استعمال کرنے والا کوئی اور کمینہ ہو تو تب تمہارے بھائی نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک بات کی تھی۔"

"تم یہ کیوں نہیں سوچتے ہر لڑکی گل ہی ہوتی ہے ہر گل کسی نہ کسی کی [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] اس علاقے سے تعلق رکھتے ہو جہاں کے لوگ عورتوں کی عزت کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور علاقے قوم کی تخصیص نہیں کرتے سب عورتیں چاہے ان کا تعلق کہیں سے ہو تمہارے لیے قابل احترام ہیں اور یہی تمہاری اس جی داری کا غرور رہا کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے ہماری پشت پر ہمارے پٹھان

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بھائی ہمیں کبھی غیر کے سامنے جھکنے اور ذلیل نہیں ہونے دیں گے۔"

ہم اس دن بہت رویا تھا پھوٹ پھوٹ کر۔ ہم نے مرنے کی کوشش بھی کی مگر تمہارے بھائی نے ہمیں بانہوں میں لے کر روک لیا تھا پھر کہا حرام موت ایک پکا مسلمان نہیں مرا کرتا توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ موت سے پہلے توبہ کر لی جائے تو رب کائنات کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔

ہوٹل میں بغاوت اور ہوٹل کے سامان کی پامالی پر ہم پریشان تھے کہ تمہارا بھائی یہاں بھی ہمارا وکیل بن گیا اس نے اس مینیجر کو ایک ویڈیو فلم دکھائی، پھر سخت درشت لہجے میں بولا تھا "اگر تم نے اس معاملے کی اطلاع انتظامیہ کو دی تو یہ ویڈیو فلم تمہاری بیوی کو بھیج دی جائے گی۔ میں نے سنا ہے وہ غصے میں قتل بھی کر دیتی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے یہ سارے عیش، آرام اور عیاشی اسی کی دولت کے مرہون منت ہے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے تم یہ عیش برقرار رکھنا چاہتے ہو یا نوکری۔"

تمہارے بھائی نے اتنے آرام سے معاملہ حل کیا کہ ہماری نوکری بھی نہیں گئی اور آج ہم اپنی بچی کی شادی کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ سارا انتظام اور جہیز سب تمہارے بھائی کی رقم سے ہو رہا ہے۔ تم بہت خوش نصیب کہ ایسے فرشتے انسان کے ساتھ رہتے ہو۔ کیا لوگ ہی ہوتے [illegible] ہیں ان کی زندگی دشوار اور ملامت سے بھری ہوتی ہے مگر ان کے دامن بھلائیوں اور نیکیوں سے خالی نہیں ہوتے۔"

واثق مرزا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ شاہ میر کو ڈھونڈتا ہوا باہر آیا جو مہمانوں کے ساتھ رونق میں مصروف تھے۔ لیکن [illegible]

"واہ میرے جگر!" اس بار بھی اطلاع نے اسے [illegible] سے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"یہ تو بہت عمدہ ہوتی ہے" وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک نئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ کون؟" اس نے سوالیہ دیکھا۔ سامنے بیٹھا شخص مسکرانے لگا۔

"کسی زمانے میں مجھے گمان تھا کہ میں بہت اچھا پاکٹ مار جیب کترا ہوں میں نے ایک بار اسی شخص کی جیب صاف کی تھی۔ بہت بڑی رقم ہاتھ لگی تھی پندرہ دن آسانی سے کٹ گئے تھے پھر پندرہ دنوں بعد یہ یہیں کھڑا تھا۔ میں نے رش میں پھر اس کی جیب کاٹ لی۔ رقم اس بار بھی بڑی تھی پھر یہ معمول ہو گیا، مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیا شخص ہے اس کی ہر بار جیب کٹتی ہے مگر یہ شور واویلا نہیں کرتا آج کے دور میں تو امیر سے امیر آدمی بھی "دو روپے" کی دہائیاں دیتا ہے یہ کون سی فیری لینڈ کا شخص ہے جو یہاں اس دنیا میں آ گرا ہے یہ انسانوں سی بات نہیں مگر میں واقعی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"میرا نام رفیق ہے۔"

وہ ایک پٹھان کے ہوٹل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا اور کہا۔

"اچھا ہوا رفیق صاحب! آپ آ گئے۔ بیٹھیں چائے کا شوق ہے تو پیجئے۔ تین مہینے سے میں تمہیں پاکٹ کا والٹ دے رہا ہوں۔"

میرا تو دل تھا کہ سر اٹھا کے دیکھوں اس شخص سے میرا کیا ناتا تھا۔

"ہو جاتا ہے رفیق صاحب! جب انسان مجبور ہو، اس پر قسمت مہربان نہ ہو، وہ پڑھا لکھا بھی ہو مگر پھر بھی اچھی نوکری نہ ملے تو انسان ایسے شارٹ کٹ مارتا ہے لیکن پہلے میں بھی ایک ہی کام کر کے اکتا گیا پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے جس بوڑھے آدمی کا والٹ چرایا اس کے والٹ میں چند سو کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ اس کی بیوی کینسر کی مریضہ تھی اور وہ ان کے لیے ریڈ سیل کی بوتل لینے نکلا تھا۔ اس نے اس خط میں اپنے بیٹے کو گھر کے حالات سنائے تھے۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ملک سے باہر سیٹل اور وہ اتنا خوددار تھا کہ اس نے وہ خط لکھ تو لیا تھا مگر پوسٹ نہیں کر پایا۔ مجھے وہ چند سو نہیں سمندر جتنے آنسو لگے، وہ اس کی بے چارگی

اور کم مائیگی نے بہائے تھے۔ میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور اس کے گھر پہنچا وہ بوڑھا آدمی اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں اداس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں والٹ دیا وہ حیرت سے مجھے تکنے لگا۔

"شکریہ بیٹا اگر تم نہ آتے تو میری تو شناخت ہی گم ہو گئی تھی۔ میں کس کو کیسے بتاتا میرا کیا نام ہے میں کون ہوں کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔"

وہ چپ ہو گئے تب میں نے سوچا تھا یہ شخص نفسیات کی مار سہہ رہا تھا۔

"کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔" یہ ایک جملہ مجھ میں اٹک گیا۔ میں رونے لگا تھا۔ اس شخص نے میرے ہاتھ میں ایک کارڈ پکڑایا۔

"یہاں کل چلے جانا۔ میرا ایک دوست ہے اس کو ورکر کی اشد ضرورت ہے۔ سیلری آپ کے کھوئے پیسوں سے کم ہو گی مگر عزت کی [illegible] کی مانند کے تحفے میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

میں اٹھا اور اپنی جیب میں سے ان کا والٹ نکالنے لگا تو وہ والٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

"مجھے لگا اب آپ کو ان پیسوں کی ضرورت نہیں اس لیے یہ والٹ نکال لیا۔"

"آپ اتنے امیر ہیں تو آپ ___"

"تمہارا ایمان دوست تھا۔ کار جس میں مالک باہر تھا اور ایک محلے والے نے بتایا" وہ بلیک کلر کی گاڑی نے بار اس شخص کی ہے۔ بہت پیارا آدمی ہے جس معنی میں امیر غریب کا فرق نہیں کرتا۔"

میں نے سر ہلایا اور اسی راستے پر چل پڑا جس کا راستہ تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔ بہت قدر کرنا اس کی ایسے لوگ بہت کم [illegible] میں پیدا ہوتے ہیں۔"

اس نے دیکھا وہ ان سب باتوں سے بے پروا ابھی تک آپ کے شعروں کے گرد رقص کر رہے تھے۔

کہانی ختم ہو گئی ہے۔ اسے دیانت داری سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ جبران کے خیالات کا آئینہ ہے یہ چھوٹی بڑی باتیں نہیں کرتا لمبی لمبی پریس کانفرنسیں نہیں کرتا چھوٹے چھوٹے عملی قدم اٹھاتا ہے یہ جانتا ہے سخاوت کرنا کیا ہوتا ہے یہ جانتا ہے اگر آج ہم ہاتھ بھر بھر کے دیں گے تو ہمارا دنیاوی صندوق بھلے خالی رہ جائے مگر ہماری زندگی کی جگہ پر سرسبز پھولوں کی کیاریاں ہوں گی ہماری قبر پر آسمان شبنم افشانی کرے گا اور ہم بہت سارے دلوں میں زندہ رہ جائیں گے زندگی کے بہت سارے قصوں میں آج کے قصے کی طرح اور ان سے ملتے جلتے بہت سارے قصوں میں امید کی طرح۔"

"شاہ میر بہت دیر نہیں ہو گئی ہمیں۔" اس نے رقص کرتے شاہ میر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گئے۔ ان کی گندمی رنگت میں سارے جسم کا خون ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بخار اور یہ رقص۔ وائم کو لگا ان کا ٹمپریچر اور بڑھ گیا ہے۔

"آپ کا بخار بہت تیز ہو گیا ہے۔" وہ فکرمند ہوا مگر انہیں پروا کب تھی وہ شمل خان سے گلے مل رہے تھے رفیق سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آج کی تقریب میں مجھے بلوا کر آپ نے میری عزت بڑھائی شاہ میر صاحب!"

رفیق نے تشکر سے دیکھا اور وہ ہنس پڑے ہمیشہ کی طرح [illegible] مسکرا کے بولے۔

"نہیں آپ کی سانجھی خوشی ہیں رفیق صاحب! آپ نے اپنی مصروفیت میں سے وقت نکالا یہ واقعی بڑی بات ہے ورنہ آج کل تو لوگوں کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔"

رفیق مسکرائے اور وہ گاڑی میں آن بیٹھے۔ وائم کا دل چاہا وہ ہسپتال والی بات کا ابھی پوچھے مگر موقع نہیں ملا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں آپ دونوں؟"

"بابا جان! ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔"

"شام سے گئے ہوئے ہو اور اب آ رہے ہو۔" تیمور بھابھی جلدی آ کر بولیں۔

اور شاہ میر نرمی سے بولے "شادی کے انتظامات بھی تو دیکھنے تھے بابا جان! اس لیے دیر ہو گئی۔"

"تم وائم کو بگاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCI

نہیں بتانا چاہتے۔" یہ حیا بھابی تھیں۔

"بھلا ویسے غرانے کا مطلب ہیٹ بگڑ جانا ہی کب ہوتا ہے بھو۔"

"بابا جان! اب آپ کی اور اماں جان کی شہہ ہے، تو یہ کسی کے اختیار میں نہیں آتا۔"

شاہ میر خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے۔ انہیں برا لگتا تھا اگر ان کی وجہ سے ان کے اماں جان بابا کو سننا پڑتا۔ وہ اس صورت حال سے بچنے کے لیے کوئی معرکۃ الآرا اقتباس سوچ ہی رہے تھے کہ بابا جان نے انہیں یکدم سینے سے لگا لیا۔

"میں سمجھتا تھا میں نے سب کچھ گنوا دیا۔ شہری زندگی نے مجھ سے میری مٹی کی خوشبو رشتے ناتے سب چھین لیے مگر آج جب بھائی جی کی طرف گیا تو پورے گاؤں نے کسی وی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کیا۔ ہر شخص شناسا، ہر شخص اپنائیت سے ملا۔ سب ان ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھانے پر میرا شکریہ ادا کر رہے تھے جو میں نے شہری زندگی جینے کے باوجود ادھوری لاتعلقی کی نذر نہیں کی تھیں۔

آج بھائی جی کا فون آیا تھا، وہ شہر آ رہے تھے۔ یہاں کے ایک بڑے ہسپتال میں ان کے ملازم کی والدہ کی سرجری تھی، میں اس لیے بات کی شاہ میر! جب رشتے آپ کے اور بڑے ہوں تو آپ کا کوئی نہیں ہے یہ سرکل کوئی توڑ سکتا ہے نہ یہ سرکل ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ بیماریاں ہیں جو انسان کے اندر الارم بجا دیتے ہیں۔ میں آج بھی [illegible] اور اس وقت تمہارے ساتھ کھڑا ہو کر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ

تم نے جس طرح سے میری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لیں، انہیں نبھاتے رہے، ان سب کے دلوں میں تم نے جو مقام بنایا، وہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ زندگی بھی بڑی عجیب، ہر کوئی جی سکتا ہے مگر دوسروں کے رشتوں کی نگہداری نبھانا، ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ تم واقعی زندگی کی خوب صورتی ہو۔"

شاہ میر حیران اور دائم خوش ہو رہا تھا جیسے یہ ساری تعریفیں اسی کی ہو رہی ہوں۔

"پتا ہے پورے بتیس دانت ہیں اب اسے اندر بھی کر لو۔"

وہ کان کے قریب گنگنائے سو وہ جھینپ گیا۔ نیلوفر بھابی بھی مسکرانے لگیں۔ شاہ روز مسکرانے لگے اور بابا نے اچانک پوچھا۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے شاہ میر!"

"نہیں تو بابا! ابھی پروڈینس لگا کر آ رہا ہوں اس لیے گرم ہو رہا ہوں۔" دائم پھر ہنسنے لگا اور بابا نے شاہ میر کا کان پکڑ لیا۔

"نالائق! اپنے باپ پہ انحصار کرتا ہے۔" شاہ میر کچھ نہیں بولے اور دائم نے سوچا "کاش ہر شاہ میر کی طرح فیصلہ ہی کاش کر سکتا تو دنیا اور آخرت دونوں سدھر جاتیں۔ خراب لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بھی تو کم کمالی نہیں۔ اچھے لوگوں کو آج کل کون پسند کرتا ہے؟ کوئی نہیں۔ اور وہ یہ کمال رکھتا تھا۔ اس لیے خوش تھا بہت۔ ہی بنا میں اس کا بھی اضافہ کر رہی تھیں دعائیں جو قسمت کو، دل، مستقبل سب کچھ بدل دیتی ہیں۔

اور وہ مسرت سے ہر قدم بڑھانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ بھی گھر والوں کی طرح کفران نعمت نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہی تو فیصلہ تھا زندگی کا۔

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY